قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا چوہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

مارچ 2017ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال و عمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
مارچ 2017ء

جلد 70 | شمارہ نمبر 03

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
23 مارچ	ادارہ	4
سوچا کرو	غلام احمد پرویز	8
اسلامی حکومت کا سرسری نقشہ	منظور حسین لیل	17
قرآنِ کریم کی خصوصیات قرآنِ کریم کی روشنی میں	ڈاکٹر شاکر حسین خان	26
انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد اقامت دین ہوتا تھا	خواجہ ازہر عباس	40
باب المراسلات	ڈاکٹر انعام الحق	46

ENGLISH SECTION

Balancing Our Inner and Outer Worlds
By Mansoor Alam **59**

Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل) Chapter 3: Spring's Message**
(*Payam-e Fasl-e Bahar* پیام فصل بہار) – Message to Fellow-Ambassadors
(Tulu-e-Islam Convention, November, 1959) **(Episode-3)**
By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam) **60**

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ
بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465-22-003082-7
For International Transactions
IBAN: Pk21 NBPA 0465 0022 0003 0827
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام
25-B گلبرگ 2، لاہور
(پاکستان) 54660
Phone: 042-35714546 , Cell: 0321-4460787
idarati@gmail.com
www.facebook.com/Talueislam

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی
میانِ شاخساراں صحبت مرغِ چمن کب تک!
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہین قہستانی
گمان آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی
مٹایا قیصر وکسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا، زورِ حیدرؓ، فقر بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ
ہوئے احرارِ ملت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی
ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے یہ بال وپرِ رُوح الامیں پیدا

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

23 مارچ

یوں تو ہر دن اللہ ہی کا ہوتا ہے لیکن بعض دنوں میں اس قسم کے عظیم الشان انقلاب واقع ہوتے ہیں کہ قرآن انہیں ''ایام اللہ'' کہہ کر پکارتا ہے۔ اسی طرح قوموں کی زندگی میں بعض دن ایسے آتے ہیں جن میں ان کا کاروان حیات ایک نیا موڑ مڑتا ہے اور اس سے ان کی قسمت کا پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ اس قسم کے دن قوموں کی زندگی میں یادگار بن جاتے ہیں اور تاریخ کے اوراق میں درخشندہ حروف میں لکھے جاتے ہیں مسلمانانِ ہندو پاکستان کی حیات ملی میں گذشتہ پچیس سال کے عرصہ میں کئی دن ایسے آئے ہیں جن کی یاد کو تاریخ اپنی آغوش میں محفوظ رکھے گی۔ ان میں سب سے پہلا یادگار دن 29 دسمبر 1930ء کا تھا جب الہٰ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں، حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اپنا وہ خطبۂ صدارت ارزانی فرمایا جس نے فی الحقیقت اس قوم کے مستقبل کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ اس سے پہلے مسلمانانِ ہند ایک راہ گم کردہ قافلے کی طرح پریشان و سرگرداں، ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے۔ ان کے پاؤں اٹھتے تھے لیکن نہ سراغ راہ ان کے سامنے تھا نہ نشانِ منزل۔ وہ ہر دور سے نظر آنے والے غبار کی طرف لپک کر بڑھتے تھے کہ شاید اس میں وہ ''شہ سوارِ اشہبِ دوراں'' ہو جو انہیں صحیح و سلامت منزل مقصود تک لے جائے لیکن اس کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جاتے تھے کہ وہ غبار، بگولے کے رقص سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس تشتت و انتشار اور یاس و حزن کے عالم میں اس حکیم الامت نے جسے قرآنی بصیرت نے دیدۂ انجم عطا فرمایا تھا، ان پراگندہ افرادِ کارواں کو پکارا اور نہایت حکمت و تدبر اور شفقت و محبت سے انہیں بتایا کہ ان کی منزل مقصود کیا ہے اور اس تک پہنچنے کا صحیح راستہ کونسا۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے مخاطبین سے کہا کہ:

> آپ نے مسلم لیگ کے اس اجلاس کی صدارت کے لئے اس شخص کو منتخب کیا ہے جو اسلام کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ اسے پورا پورا یقین ہے کہ اسلام میں وہ قوت موجود ہے جو انسان کو اس کی تنگ نظری سے نجات دلا سکتی ہے جسے جغرافیائی حدود نے پیدا کر دیا ہے۔ جس کا ایمان یہ ہے کہ ایک فرد یا مملکت کی زندگی میں مذہب کی قوت بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ اور جو (اس حقیقت پر علیٰ وجہ البصیرت) یقین رکھتا ہے کہ اسلام اپنی تقدیر آپ ہے۔ اس لئے دنیا کا کوئی حادثہ اسے تباہ نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ یہ تمہاری غلط نگہی ہے جو تم نے سمجھ رکھا ہے کہ مسلمانوں کی قومیت وطن کی حدود سے متشکل ہوتی ہے۔ ان کی قومیت کا مدار اسلام پر ہے۔

جس نے جذبات اور وفا شعاریوں کے وہ بنیادی اصول عطا کئے ہیں جو رفتہ رفتہ پراگندہ افراد اور منتشر گروہوں میں یک جہتی اور یک نگہی پیدا کر کے انہیں آخرالامر ایک متعین قوم میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

قومیت کی ان نئی بنیادوں کی وضاحت کے بعد، وہ مسلمانانِ ہند کے مستقبل کو سامنے لائے اور کہا کہ:

میں چاہتا ہوں کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے ایک مملکت بنا لیا جائے۔

انہوں نے اپنی اس آواز کے اظہار تک ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایمان و ایقان کی ایک ایسی آواز کے ساتھ جو دل کی گہرائیوں سے ابھرا کرتی ہے، پورے حتم و یقین سے فرمایا کہ:

حکومت برطانیہ کے دائرہ کے اندر رہ کر ہو یا آزادانہ طور پر۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں مسلمانوں کی ایک مستحکم اور متحدہ مملکت کا قیام ان کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔

یہ تھا نشانِ منزل (یعنی ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں مسلمانوں کی ایک متحدہ مملکت کا قیام) اور وہ تھا سراغِ راہ (یعنی وطنی، نسلی، لسانی نسبتوں سے بلند ہو کر، محض اسلام کی بنیادوں پر مسلم قومیت کی تشکیل) جو 29 دسمبر 1930ء کو اس پراگندہ فکر اور افسردہ خاطر قوم کے سامنے رکھا گیا۔ یہ دن، فی الحقیقت مسلمانانِ ہندوستان کی زندگی میں، ہمیشہ زندہ و تابندہ رہنے والا دن تھا۔

چونکہ ہر انقلابی آواز کی طرح یہ آواز بھی اپنے زمانے سے بہت آگے تھی اس لئے کسی نے اسے سنجیدگی سے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ لیکن زمانے کے تقاضے قوم کو کشاں کشاں اسی طرف لئے جا رہے تھے۔ انہی تقاضوں نے ان میں قائداعظمؒ جیسی شخصیت کو ابھار دیا۔ انہوں نے سب سے پہلے، قومیت کے اس ''جدید'' تصور کے ماتحت، مسلمانانِ ہند کو ایک جداگانہ ملت کی حیثیت سے منظم کیا اور اس کے بعد ان میں اس منزل کے شعور کو بیدار کیا جس کا نشان اقبال نے ۱۹۳۰ء میں دیا تھا۔ چنانچہ چند ہی سال کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو، اسی حکیم الامتؒ کے مرقد کے سرہانے کھڑے ہو کر اپنے اس عزم کا اعلان کیا کہ ہم ہندوستان میں اپنی جداگانہ مملکت کو قائم کر کے رہیں گے۔ یہ دن اس قوم کی کتابِ زندگی میں ستاروں کی روشنائی میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

اس عزم کے بعد، اس منزل تک پہنچنے کے لئے مسلسل جدوجہد جاری رہی تا آنکہ انہیں نہ صرف شمال مغربی بلکہ اس کے ساتھ ہی شمال مشرقی ہند میں بھی ایسا خطۂ زمین مل گیا جس میں یہ اپنے تصورات کے مطابق اپنی آزاد مملکت قائم کر سکتے تھے۔ یہ انقلابِ عظیم 14 اگست 1947ء کو واقع ہوا۔ یہ دن ان کی حیات ملی میں ہزاروں مسرتوں اور لاکھوں شادمانیوں کا پیامبر تھا اور بلاشائبۂ تشکیک، قرطاسِ ارض پر سورج کی کرنوں سے مرصع کاری اور زرنگاری کا مستحق۔ اس طرح سترہ سال کے قلیل عرصہ میں (جو قوموں کی زندگی میں پلک جھپکنے سے زیادہ کا عرصہ نہیں کہلا سکتا) ایک ''شاعر کا خواب'' خوابِ یوسف کی طرح، حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ گیا۔

لیکن جہاں ایک طرف اس قوم کی قسمت کے ستارے یوں ایک ایک کر کے بیدار ہوتے جا رہے تھے تاریکی کا ایک گوشہ بھی اس کے ساتھ چلا آ رہا تھا کہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور دیا لیکن قبل اس کے کہ یہ حقیقت منتظر لباس مجاز میں سامنے آ جائے وہ ہم سے رخصت ہو گیا۔ پھر جناحؒ نے وہ خطۂ ارض حاصل کر لیا جس میں اس جدید مملکت کو متشکل ہونا تھا لیکن قبل اس کے کہ اس کی بنیادیں اس نقشے کے مطابق استوار ہوں۔ وہ بھی ہمیں الوداع کہہ گیا۔ اب قوم کے برسر اقتدار طبقہ کی حالت ان رئیس زادوں کی سی ہو گئی جنہیں بیٹھے بٹھائے ایک ریاست ورثہ میں مل جائے۔ اور عوام کی حالت ان یتیموں کی سی جن کا کوئی والی وارث ہی نہ رہے۔ چنانچہ اس عرصہ میں اوپر کے طبقے نے اس مفت میں ملی ہوئی ریاست کا جو کچھ حشر کیا اور نیچے کے طبقے کے ساتھ جو کچھ بیتی اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ:

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا ۚ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿9:82﴾

انہوں نے جو کچھ اپنے ہاتھوں سے کیا ہے انہیں چاہئے کہ اسے دیکھ کر روئیں بہت زیادہ اور ہنسیں بہت کم۔

اقبال نے تخلیق پاکستان کی اہمیت یہ بتائی تھی کہ:

ہندوستان میں بہ حیثیت ایک ثقافتی قوت کے اسلام کی زندگی کا دارومدار اس پر ہے کہ اسے ایک خاص خطہ میں مرکوز کر دیا جائے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ ''یہ خطۂ زمین بیرونی حملہ آوروں کی مدافعت کا ذریعہ بن جائے گا خواہ وہ حملے توپ و تفنگ کے ہوں اور خواہ نظریات و تصورات کے۔'' اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ

اس سے اسلام کو اس کا موقع مل سکے گا کہ وہ اپنے آپ کو ان اثرات سے پاک اور صاف کر لے جنہوں نے اسے عربی ملوکیت کے زمانے میں ملوث کر دیا تھا۔ یہ اپنی تعلیم، اپنی ثقافت اور اپنے قوانین کو ایک طرف حقیقی اسلام سے اور دوسری طرف دور حاضرہ کے تقاضوں سے قریب تر کر سکے گا۔

یہ تھے وہ فوائد جو اسلام کو اس صورت میں حاصل ہونا تھے جب شمال مغربی خطہ ایک واحد مملکت بن جاتا۔ اب جبکہ ہم نے شمال مغربی خطہ کو ایک مملکت بنا لیا ہے، ہمارے پیش نظر ان مقاصد کا حصول ہونا چاہئے۔ یعنی ہم اس خطۂ زمین میں ایسا معاشرہ قائم کریں جو حقیقی اسلام (یعنی قرآن) کے اصولوں پر متشکل ہو اور ان اصولوں کی روشنی میں ہم ایسے جزئی قوانین مرتب کریں جو دور حاضر کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کر سکیں۔ اسی سے اسلام ان غیر اسلامی عناصر سے منزہ ہو سکے گا جو ہمارے دور ملوکیت کی یادگار ہیں اور جنہیں ہم غلط فہمی سے ہزار برس سے (حقیقی اسلام سمجھ کر) سینے سے لگائے پھر رہے ہیں اور اسی سے ہمارا دین ایک زندہ قوت بن کر دنیا میں ہماری حفاظت اور صیانت کا ذمہ دار بن جائے گا۔ اس لئے کہ (اقبال کے الفاظ میں) تاریخ کے نازک ادوار میں، اسلام نے مسلمانوں کو بچایا ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کو نہیں بچایا۔''

اقبالؒ نے اپنے مذکورۂ بالا خطبہ میں یہ بھی بتایا تھا کہ ہمارے زوال کی دو علتیں بالکل نمایاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم میں صحیح

ٹائپ کے لیڈر نہیں۔

لیڈر سے میری مراد ایسے افراد ہیں جو اپنی خداداد بصیرت یا تجربہ کی بنا پر اسلام کی روح اور اس کی غایت سے پوری طرح واقف ہوں اور دوسری طرف عصر حاضر کے تقاضوں کا بھی صحیح صحیح احساس رکھتے ہوں۔ اس قسم کے افراد درحقیقت قوم کے لئے ''خدائی قوت'' کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے بنے بنائے ملتے ہیں۔ آرڈر دے کر بنوائے نہیں جاسکتے۔

دوسری علت انہوں نے یہ بتائی تھی کہ ہماری قوم میں ''ملی شعور'' کی کمی ہوتی جارہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے ذاتی مفاد کے پیچھے پڑا رہتا ہے اور ملت کے تعمیری کاموں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں اس وقت کوئی لیڈر بھی ان خصوصیات کا حامل نہیں جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ جو لوگ فضا میں خلا کی وجہ سے مذہبی پیشوائیت کی مسندوں پر متمکن ہو گئے ہیں اور زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں انہیں نہ اس کا علم ہے کہ اسلام کی روح اور غایت کیا ہے اور نہ ہی اس کا شعور کہ عصر حاضر کے تقاضے کیا۔ لیکن اس کمی کو اس طرح پورا کیا جاسکتا ہے کہ ہم باہمی مشاورت سے اپنے تمام معاملات میں قرآن سے راہنمائی حاصل کریں اور اس کی روشنی میں عصر حاضر کے پیش کردہ مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کوشش میں ہم کسی جگہ غلطی بھی کر جائیں۔ لیکن غلطیوں سے کبھی گھبرانا نہیں چاہئے۔ مزید تجربہ غلطیوں کی اصلاح خود بخود کر دیا کرتا ہے۔ باقی رہی قوم میں ملی شعور کی بیداری' سو اس کی واحد صورت وہی ہے جسے قرآن نے بطور اصل الاصول پیش کیا ہے۔ یعنی انفرادی مفاد کو کم از کم کر کے ملی مفاد کو زیادہ سے زیادہ کر دیا جائے۔ بالفاظ دیگر' رزق کے سرچشموں کو انفرادی ملکیت سے نکال کر ملت کی اجتماعی تحویل میں دے دیا جائے تاکہ وہ انہیں تمام افرادِ ملت کی نشوونما کے کاموں میں صرف کر سکے۔ قرآن نے اقوام کی تخلیق اور نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم اصول بتایا ہے اور وہ یہ کہ پوری کی پوری قوم ایک فرد واحد کی حیثیت سے زندگی بسر کرے۔ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ (31:28)- اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ رزق کے سرچشموں میں افراد کا الگ الگ مفاد نہ رہے بلکہ پوری ملت کا مفاد مشترکہ ہو اور اس کے بعد کسی کے دل میں قطعاً یہ خیال نہ پیدا ہو کہ وہ سندھی ہے یا پنجابی۔ بلوچی ہے یا سرحدی۔ اگر اسلام لانے کے بعد بھی' امتیازاتِ رنگ و بو کے یہ بت ہمارے دلوں میں قائم رہے تو سمجھ لیجئے کہ ہمارے دلوں میں ایمان نے گھر نہیں کیا۔ ہم بدستور مشرک کے مشرک ہیں۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ (76:3)

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلی قسط

سوچا کرو

قرآن کریم کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ اس نے وسیع و عریض کارگہ کائنات کے حقائق اور نفس انسانی کے عمیق و دقیق رموز و اسرار، ایسے مرتکز (Concentrated) انداز سے بیان کئے ہیں کہ اس کے ایک ایک قطرے میں سمندر سمویا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے جامع صحیفۂ کائنات، اور مکمل ضابطۂ حیات کی ضخامت اتنی مختصر ہے کہ اگر اسے انگریزی زبان کے باریک ٹائپ میں چھاپا جائے تو چند اوراق میں قلمبند ہو جائے۔ اس تحیر انگریز ارتکاز کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:

حضور نبی اکرم ﷺ نے عمر بھر، قرآن کریم کی انسانیت ساز تعلیم، قریش کے سامنے پیش کی اور انہوں نے اس کی جی بھر کے مخالفت کی۔ آخر الامر، آپ ﷺ نے ان سے ایک دن کہا کہ میں عمر بھر تم سے تفصیلی گفتگوئیں کرتا رہا ہوں، لیکن آج میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بات

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ (34:46)۔۔۔ اے رسول! ان سے کہو کہ میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

انہوں نے جی میں کہا کہ یہ صرف ایک بات کہنا چاہتا ہے اس کے سن لینے میں کیا حرج ہے؟

انہیں اس طرح آمادہ پا کر آپؐ نے فرمایا کہ وہ بات ایسی معمولی نہیں کہ تم اسے یونہی چلتے چلتے سن لو۔ وہ بڑی اہم بات ہے اس لیے اسے کھڑے ہو کر دل کے کانوں سے سنو۔۔۔ سب نہیں تو ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ۔۔ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى (34:46)۔۔۔ جب آپؐ نے انہیں اس طرح نفسیاتی طور پر اپنی طرف متوجہ کر لیا تو فرمایا کہ میں جو بات تم سے کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ:

ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۗ ۔۔۔ (34:46)

تم، سوچا کرو۔

اس ایک لفظ میں، قرآن کریم نے حقائق و رموز انسانی کی کتنی دنیائیں سمٹا کر رکھ دی ہیں، اس کا صحیح اندازہ وہی قومیں لگا سکتی ہیں جو عقل و فکر کی اہمیت سے واقف ہیں۔ ہمارے لیے تو اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ سارا قرآن، عقل و فکر اور غور و تدبر کی تاکید سے بھرا پڑا ہے، حتیٰ کہ ان سے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے وہ انسان نہیں، حیوان ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے۔ (7:179) یہ اہل جہنم میں سے ہیں۔ (7:179)

قرآن کریم نے یہ کہہ کر جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے، وہ انسان نہیں، بلکہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں، نہ صرف فکر انسانی کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے بلکہ اس کی تخلیقی تاریخ کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے۔ قرآنی حقائق (اور عصر حاضر کے

سائنٹفک انکشافات) کی رو سے زندگی (کسی خاص فرد یا نوع کی زندگی نہیں، بلکہ خود زندگی) اولیں جرثومہ حیات کے نقطہ آغاز سے اپنی ارتقائی منازل طے کرتی، پیکر انسانی تک پہنچی ہے۔ اس کے اس سفر میں دو باتیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں، یعنی:

تکرار ہی تکرار:

1۔ جس نوع نے جس مقام پر کش مکش حیات سے منہ موڑ لیا، وہ اسی مقام پر رک کر رہ گئی۔ آگے نہیں بڑھ سکی۔ اس کا مقصد حیات اپنے آپ کو دہرائے چلے جانا (Repition) یا (Reproduction) رہ گیا۔ لاکھوں، کروڑوں سال سے چھپکلی اپنے جیسی چھپکلیاں پیدا کر کے ختم ہو جاتی ہے۔ بکری، اپنے جیسی بکری ہی پیدا کر سکتی ہے۔ بالفاظ دیگر، جب کوئی نوع ایک مقام پر رک جاتی ہے تو اس کی زندگی کی حرکت، دوری (Cyclic) رہ جاتی ہے، ارتقائی یا صراطی (Evolutionary) نہیں رہتی۔ اور

2۔ ہر نوع جو آگے بڑھتی ہے اس میں، سابقہ نوع کے مقابلہ میں، دماغی استعداد کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ جب کوئی نوع کسی مقام پر رک جاتی ہے تو اس کی ''ذہنی استعداد'' بھی وہیں منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔

زندگی جب انسانی پیکر میں پہنچی تو اس کی ''ذہنی استعداد'' کو فکر سے تعبیر کیا گیا۔ فکری صلاحیت، خاصۂ انسانیت ہے۔ حیوان اس سے محروم ہیں۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے فکری صلاحیتوں کو کام میں نہ لانے والے انسانوں کو اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط (7:179)۔۔۔ کہہ کر پکارا ہے یعنی حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے والے، بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ، کیونکہ حیوانات (کم از کم) اپنی حیوانی صلاحیتوں (Instinct) سے تو کام لیتے ہیں!

فکری ارتقاء:

سطح بیں لوگ کہا کرتے ہیں کہ اگر نظریہ ارتقاء صحیح ہے تو انسان کسی اور نوع میں تبدیل کیوں نہیں ہو گیا؟ وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اب ارتقاء جسموں اور پیکروں کے تغیر و تبدل کی شکل میں نمودار نہیں ہوتا۔ منزل انسانیت میں پہنچ کر، فکری ارتقاء کا آغاز ہوا ہے اور اس ارتقاء کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ ذرا سوچئے کہ کیا لاکھوں سال پہلے کا غاروں میں بسنے والا انسان، اور چاند ستاروں کو مسخر کرنے والا آج کا انسان، فکری طور پر ایک ہی نوع کے افراد ہیں؟ آج کا انسان، غاروں میں بسنے والے انسان سے یقیناً ایک مختلف ''نوع'' کا انسان ہے۔

وحی کا مقصد، انسانی فکر کو جلا دے کر، اس کی آماجگاہ کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلا جانا ہے۔ جہاں تک فکری جلا کا تعلق ہے، قرآن کریم شروع سے آخر تک، غور و تدبر پر زور دیئے چلا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝ (47:24)

یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے دلوں نے اپنے اوپر، خود وضع کردہ تالے ڈال رکھے ہیں تاکہ ان کے اندر کچھ داخل ہی نہ ہو سکے۔

وہ ان لوگوں کو مومن ہی تسلیم نہیں کرتا جو عقل وفکر سے کام لیے بغیر، کسی بات کو یونہی سچا مان لیں۔ وہ مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (25:73)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اور تو اور، جب ان کے سامنے آیات خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں، تو وہ ایسا نہیں کرتے کہ عقل وفکر کو بالائے طاق رکھ کر، اندھوں اور بہروں کی طرح ان پر گر پڑیں۔ وہ انہیں علم وبصیرت کی رو سے تسلیم کرتے ہیں۔

جہاں تک انسانی فکر کے میدان کی توسیع کا تعلق ہے، وہ کہتا ہے کہ

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (2:219-220)

اس طرح اللہ تعالیٰ حقائق کو نمایاں طور پر سامنے لاتا ہے تاکہ دنیا اور آخرت، دونوں کی زندگی پر غور وفکر کر سکو۔

انسان کو فکری صلاحیت عطا کر کے، اسے حیوانات سے ممتاز کر دیا۔ اور اخروی زندگی کو فکر کے دائرے میں شامل کر کے، مومن اور کافر میں امتیاز کر دیا۔ لہٰذا الدین (اسلام) نام ہے، دنیا اور آخرت کی زندگی میں غور وفکر سے کام لینے کا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سلسلہ ارتقاء کی رو سے، انسان کی فکری صلاحیت بڑھتی اور بلند ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے کسی ایک دور (زمانہ) کی فکری سطح حرف آخر نہیں قرار پا سکتی۔

دین یہ کچھ کرتا ہے۔ اس کے برعکس مذہب، کسی ایک زمانہ کی فکری سطح کو حرف آخر قرار دے کر، اسے وہیں منجمد کر دیتا ہے۔ اس سے انسانی زندگی، حیوانی سطح (کالانعام) پر پہنچ جاتی ہے اور اس کا مقصد (آگے بڑھنے کے بجائے) تکرار (Repition) رہ جاتا ہے یعنی جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اسے ابدی طور پر غیر متبدل قرار دے کر، اس کی ہو بہو نقل کرتے رہنے کو مقصد حیات سمجھ لینا۔ اسے مذہب کی اصطلاح میں تقلید کہتے ہیں۔ قلادہ اس رسی یا طوق کو کہتے ہیں جسے مویشیوں کے گلے میں ڈال دیا جاتا ہے، اور اس سے مویشی کو جدھر جی چاہے چلایا جاتا ہے۔ غور کیجئے کہ معانی کے اعتبار سے بھی تقلید سے انسان کی پوزیشن کیا ہو جاتی ہے۔ چونکہ تقلید (مذہب) کا مدار عقل وفکر پر ہوتا ہی نہیں، اس لیے اس میں سوچ کو حرام قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہزاروں سال پہلے کی انسانی فکر اس قابل ہوتی ہی نہیں کہ وہ اتنے زمانے بعد کی فکر کو دلائل سے مطمئن کر سکے۔ بجائے اس کے کہ مذہب اس حقیقت کا اعتراف کرے، وہ سرے سے غور وفکر ہی کو حرام قرار دے دیتا ہے۔ اس خود فریبی یا ابلہ فریبی سے وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے مسلک کو ''الحاد و بے دینی'' کے حملوں سے محفوظ کر لیا ہے۔ اگر کہیں سے دلیل طلبی کی آواز اٹھتی ہے تو وہ عوام کے جذبات کو یہ کہہ کہ مشتعل کر دیتا ہے کہ یہ شخص تمہارے سلف صالحین اور ائمہ مقدسین کے مسلک کو جھوٹا کہتا ہے۔ عوام پر عقل وفکر کے دروازے پہلے ہی بند ہوتے ہیں جب ان کے جذبات کو بھڑکا دیا جائے تو ان کے آتش فشاں کا لاوا ابل پڑتا ہے۔۔۔ دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک حادثہ وہ ہوتا ہے جب جہالت، میدان عمل میں اتر آئے!

مذہب' اس قسم کے وقتی ہنگامے تو برپا کرا سکتا ہے' دوام اس کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ مذہب پرست قومیں' اہل فکر و عمل قوموں سے کوسوں پیچھے ہوتی ہیں۔ وہ قومیں' ہر آن آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن مذہب پرست قوم اپنے مقام پر کھڑی' حرکت میں مصروف رہتی ہے اور اس سعی لاحاصل سے تھک کر' مرور زمانہ کے ہاتھوں' غبار کارواں کی طرح' خاک نشین ہو جاتی ہے' اور۔۔۔ قرآن کے الفاظ میں' نہ آسمان ان کے غم میں روتا ہے' نہ زمین ان کی موت پر آنسو بہاتی ہے۔۔۔۔ (44:29)

کائنات میں تفکر:

پہلے کہا جا چکا ہے کہ قرآن کریم نے تاکید کی ہے کہ ''دنیا اور آخرت میں فکر کیا کرو۔ دنیا سے مراد خارجی کائنات ہے۔'' اس کے متعلق اس نے کہا کہ

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (45:13)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (ارض و سماوات) میں جو کچھ ہے' خدا نے ان سب کو تمہارے لیے مسخر کر رکھا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیں (حقیقت تک پہنچنے کی) بہت بڑی نشانیاں ہیں۔

کائنات میں قوانین فطرت کارفرما ہیں' جو اٹل اور غیر متبدل ہیں۔ یہ قوانین انسانی فکر کے وضع کردہ نہیں (خدا کے متعین کردہ ہیں) لیکن انسانی فکر انہیں دریافت کر سکتی ہے۔ اس کے بعد' ان قوانین کی رو سے' فطرت کی مخفی قوتوں کو منکشف کیا جا سکتا اور انہیں اپنے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ انسانی فکر جوں جوں آگے بڑھتی جاتی ہے' تسخیر فطرت کے نت نئے گوشے نمودار ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جب مذہب' انسانی فکر کو ماضی کی کسی منزل میں ساکن اور منجمد کر دیتا ہے' تو فطرت کے متعلق جو کچھ اس وقت تک معلوم ہو چکا ہوتا ہے (یا جو نظریات اس وقت قائم ہوتے ہیں) ان کا علم اس سے آگے نہیں بڑھتا۔ اگر کوئی مفکر یا سائنسدان' تازہ فکر کی رو سے کوئی نیا انکشاف کرتا ہے' تو مذہب یہ کہہ کر اس کے خلاف موت کا فتویٰ صادر کر دیتا ہے کہ یہ نظریہ اسلاف کے مسلک کے خلاف' لہٰذا الحاد اور بے دینی ہے۔ یورپ (عیسائیت) کی سولھویں' سترھویں صدی سے پیشتر کی تاریخ اس ''معرکہ مذہب اور سائنس'' کی تاریخ ہے۔ اس میں' گیلیلیو یا کوپرنیکس' جیسے سائنس دانوں کو اس جرم کی پاداش میں مستحق دار و رسن قرار دیا گیا تھا کہ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ زمین گول ہے یا گردش کرتی ہے۔ اقوام مغرب نے تنگ آ کر' آخر مذہب کا لبادہ اتار کر پھینکا تو آج چاند تک کو اپنے زیر قدم لانے کے قابل ہو گئیں۔ ان کا پادری تو آج بھی یہ کہتا ہے کہ کائنات' فلاں سن' فلاں مہینے اور فلاں دن کو وجود میں آئی تھی' لیکن اس کی اس آواز کو گرجا کی چار دیواری سے باہر' درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔

اقدار حیات:

لیکن چونکہ وہ قومیں ''آخرت کی زندگی'' (خدا کے قانون مکافات یا اقدار خداوندی) کی قائل نہیں' اس لیے وہ جوں

جوں، فطرت کی قوتوں کی تسخیر میں آگے بڑھتی جاتی ہیں، باہمی تصادمات سے، انسانی دنیا کو جہنم زار بنائے چلی جارہی ہیں، جس میں خود بھی جلتی ہیں اور باقی انسانیت کو بھی جلاتی ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار
عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا !
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا !
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

(یہاں، عشق اور فرمان نظر سے مراد اقدار حیات اور ان کی صداقت پر یقین ہے)۔

قرآن نے ''دنیا اور آخرت'' دونوں کو فکر کی جولانگاہ قرار دیا ہے۔

''دنیاوی فکر'' سے مراد وہ تمام علومِ سائنس ہیں جس کی تحصیل کے لیے اقوام مغرب کی (مذہب کی گرفت سے آزاد شدہ) فکر اس قدر مصروف سعی و کاوش ہے۔ قرآن کریم نے (چھٹی صدی عیسوی میں) ان علوم کی تحصیل کو مومن کی زندگی کا شعار بتایا تھا۔ اس کی تائید میں بکثرت آیات پیش کی جاسکتی ہیں (اور میں، اس سے پہلے، متعدد بار انہیں پیش کر چکا ہوں) لیکن یہاں صرف ایک آیت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

سورہ فاطر میں ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ (35:27) کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ بارش کا نظام کیا ہے اور انواع و اقسام کی فصلوں، پھولوں اور پھلوں کی پیدائش و افزائش کون سے قوانین فطرت کی رو سے ظہور پذیر ہوتی ہے؟۔۔۔ آپ غور کیجئے کہ ان دونوں شعبوں کے تحت کس قدر علوم سائنس آجاتے ہیں؟۔

اس کے بعد ہے:

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ۝ (35:27) اور کبھی تم نے اس پر غور کیا ہے کہ پہاڑ، جو نظر بظاہر، چٹانوں کے بے ہنگم انبار دکھائی دیتے ہیں، ان کے مختلف رنگوں کے قطعات۔۔۔۔ کوئی سفید، کوئی سرخ، کوئی کالا بھجنگ۔۔۔ کس قسم کے ارتقائی نظام کی شہادت دیتے ہیں۔۔۔۔ آپ دیکھئے کہ اس میں کتنے علوم سائنس شامل ہوجاتے ہیں؟

ازاں بعد فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ (35:28) اسی طرح انسانوں، دیگر حیوانوں اور مویشیوں پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ ان کی کس قدر اقسام ہیں اور ہر قسم (نوع) کس طرح منفرد خصوصیات کی

حامل ہے۔۔۔۔اس کے تحت سائنس کی کس قدر متعدد شاخیں آجاتی ہیں۔

ان تصریحات کے بعد کہا: اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ (35:28) صحیفہ فطرت کے یہ اوراق، یوں تو سب کے سامنے کھلے رہتے ہیں، لیکن ان قوانین کی عظمت کے سامنے وہی لوگ جھکتے ہیں جو ان پر علم وبصیرت کی رو سے غور وفکر کرتے ہیں۔ یہی لوگ ''علماء'' کہلانے کے مستحق ہیں۔

آپ سوچئے کہ ان آیات میں، علماء کا ترجمہ سائنٹسٹ (Scientist) کے سوا کچھ اور بھی ہوسکتا ہے؟ دین میں عالم، سائنس دان ہی کو کہتے تھے۔

لیکن جب دین (اسلام) مذہب میں بدل گیا تو فکر کے دروازے بند کر دیئے گئے، اور علوم سائنس کو کفر اور الحاد قرار دے دیا گیا۔ کائنات کے متعلق جو تصورات اس زمانے میں عام تھے، جب فکر کو منجمد کیا گیا تو وہ حرف آخر قرار پا گئے اور ان کے خلاف سوچنے یا کچھ کہنے کو ارتداد ٹھہرا دیا گیا۔۔۔۔(مثلاً مذہب کا ارشاد ہے کہ) سب سے پہلا انسان، مٹی کا ایک پتلا تھا جس کی پسلی چیر کر اس میں سے ایک عورت نکالی گئی اور ان دونوں کے اختلاط سے نسل انسانی کا سلسلہ آگے بڑھا۔ اس پہلے انسان (حضرت آدمؑ) کا قد ساٹھ گز کا تھا۔ آسمان شیشے کا ڈلا ہے جس میں (ستارے) جواہرات کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ سورج، شام کو خدا کے عرش کے نیچے چھپ جاتا ہے جہاں سے فرشتے اسے، دوسری صبح نکالتے ہیں۔ دوزخ کا منہ باندھا ہوا ہے اور اسے سال میں صرف دو سانس لینے کی اجازت ہے۔ جب وہ سانس باہر کی طرف لیتا ہے تو گرمی کا موسم آجاتا ہے، جب اندر کھینچتا ہے تو سردی کا موسم آجاتا ہے۔ زمین چپٹی ہے اور ساکن۔ بنی اسرائیل کے جو اسباط (قبائل) گم ہو گئے تھے، وہ چوہوں کی شکل میں پیدا ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ (یہ بخاری شریف کی احادیث ہیں) اگر کوئی شخص ان سے انکار کرے تو اسے دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس فکری جمود کا نتیجہ ہے کہ اقوام عالم کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہیں، اور ہم زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے دست نگر ہیں۔ اتنا ہی نہیں کہ ہم خود علوم سائنس کی تحصیل نہیں کرتے۔ سائنس کی رو سے جو نئی ایجاد دنیا کے سامنے آتی ہے، مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس سے مستفید ہونے کو بھی ناجائز قرار دے دیا جاتا ہے۔۔۔۔ ریڈیو کا استعمال ناجائز ہے۔ ٹیلی ویژن دیکھنا بھی گناہ ہے کیونکہ اس میں چلتی پھرتی انسانی تصویریں سامنے آتی ہیں۔ ٹیلی فون میں شیطان بولتا ہے۔ مردہ کی آنکھوں کو اندھوں کی پیشانی میں پیوند کرنا ناجائز ہے۔ اسی طرح دیگر اعضا کی پیوند سازی (تقلیم) بھی ناجائز ہے۔ جب مغربی خلانورد چاند پر پہنچے ہیں، تو ہمارے مذہبی حلقوں کی طرف سے آوازیں بلند ہوئی تھیں کہ یہ دعویٰ بالکل باطل ہے۔ چاند ایسا ہے ہی نہیں کہ اس پر کسی انسان کا پاؤں ٹک سکے۔ حضور ﷺ نے اپنی انگلی کے اشارے سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔ ایک ٹکڑا آپؐ کی دائیں بغل کے نیچے سے نکل گیا تھا۔ دوسرا ٹکڑا بائیں بغل کے نیچے سے۔ وقس علیٰ ھذا ان ''نظریات'' کو پیش کرنے والے ہمارے ہاں ''علماء کہلاتے ہیں''۔ آپ غور فرمایئے کہ دین کے علماء اور مذہب کے علماء میں کس قدر فرق ہے؟

فکر آخرت:

اب آیئے ''فکر آخرت'' کی طرف۔ کارگہ کائنات میں فکری جمود کا نتیجہ تو متاع فطرت سے محرومی اور حرماں نصیبی ہے۔ اخروی زندگی سے متعلق امور میں فکر (سوچ) کے شجر ممنوعہ قرار پا جانے سے ہم نہ دین کے رہے نہ دنیا کے۔ اخروی زندگی میں غور وفکر کے لیے قرآن کریم نے ایک ایسے نظام معاشرہ کے قیام کو ضروری قرار دیا تھا جس کی عمارت' اقدار واصول خداوندی پر استوار ہوتی ہے۔ ان اقدار واصول کی کیفیت یہ ہے کہ

1۔ قوانین فطرت کی طرح، یہ اقدار واصول بھی فکر انسانی کی تخلیق نہیں۔ خدا کے متعین فرمودہ ہیں۔

2۔ یہ بھی قوانین فطرت کی طرح، غیر متبدل اور ابدی ہیں۔

3۔ قوانین فطرت کو انسانی فکر دریافت کر سکتی ہے لیکن یہ اقدار واصول وحی کے ذریعے، بوساطت انبیاء کرامؑ انسانوں کو دیئے جاتے تھے۔ اب یہ اپنی آخری، مکمل اور غیر متبدل شکل میں، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ انسانی غور وفکر ان کی صداقت کا ثبوت فراہم کر دیتے ہیں۔

4۔ قوانین فطرت اور اقدار وحی کی کارفرمائی کا انداز یکساں ہے۔ قوانین فطرت، محکم اصولوں کی طرح اپنے مقام پر اٹل رہتے ہیں، اور انسانی فکر ان کی روشنی میں نت نئے نظریات وضع کرتی، نئے نئے انکشافات کرتی اور انواع واقسام کی ایجادات ظہور میں لاتی رہتی ہے۔ اسی طرح، وحی خداوندی کی رو سے جو نظام معاشرہ قائم ہوتا ہے، اس میں یہ اقدار، غیر متبدل حدود کا کام دیتی ہیں۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، یہ نظام، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، عملی جزئیات مرتب کرتا ہے جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان اقدار پر عمل کس طرح کیا جائے۔ جوں جوں زمانے کے تقاضوں میں تبدیلیاں رونما ہوں گی اور انسانی فکر آگے بڑھتی جائے گی، ان کی عملی جزئیات میں تبدیلیاں ہوتی جائیں گی، البتہ اقدار کی رو سے متعین شدہ حدود اپنی جگہ محکم رہیں گی۔ ان جزئیات کو (اصطلاح میں) احکام شریعت کہا جاتا ہے اور جس فکری طریق سے ان میں حک واضافہ، اور ترمیم واصلاح کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اسے اجتہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔۔۔۔ اجتہاد کے معنی ہیں فکری جدوجہد۔۔۔۔ وہی فکر جس کی اس قدر تاکید کی گئی ہے۔

فکر منجمد ہو گئی:

جب اسلام، دین کی شکل میں قائم تھا تو اس میں اسلامی نظام کیا یہی نقشہ تھا۔ یعنی خدا کی مقرر کردہ اقدار (حدود) کے اندر رہتے ہوئے فکر کی کارفرمائی۔ اس کے بعد جب اسلام، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو اس کی رو سے:

1۔ انسانی فکر اس زمانے کی سطح پر پہنچ کر جامد ہو گئی جس زمانے میں دین، مذہب میں تبدیل ہوا تھا۔ اور

2۔ اس کے ساتھ ہی اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا اور انسانی فکر نے جو احکام شریعت اس زمانے میں وضع کئے تھے، انہیں ابدی اور غیر متبدل قرار دے دیا گیا۔ انہیں فقہی احکام کہا جاتا ہے۔ یہ تبدیلی، بہ حیثیت مجموعی، عباسیوں کے دور ملوکیت میں

رونما ہوئی تھی۔ ان احکام پر ملوکیت کی چھاپ کا لگنا ناگزیر تھا۔

اس وقت سے لے کر اب تک، یہ قوم، دنیاوی (کائناتی) اور اخروی (اقدار خداوندی) دونوں امور سے متعلق، اسی مقام پر کھڑی ہے جہاں اس کی فکر مفلوج اور جامد ہوئی تھی۔ اب اسلامی اور غیر اسلامی کا معیار یہ ہے کہ جو معتقدات اور نظریات، یا احکام وشعائر، ان معتقدات واحکام کے مطابق ہوں جو اس زمانے میں رائج تھے، انہیں اسلامی قرار دیا جاتا ہے۔ جو ان سے مختلف ہوں، انہیں غیر اسلامی۔ یعنی اب اسلام، اقدار واصول خداوندی کی حدود کے اندر زندگی بسر کرنے کا نام نہیں۔ ان عقائد کا معتقد اور ان احکام کا پیرو ہونے کا نام ہے، جو ملوکیت عباسیہ کے زمانے میں وضع ہوئے یا رائج تھے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اسے فقہی مسلک کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں اس نکتہ پر غور کیجئے کہ فقہ (تفقہ) کے معنی غور وفکر کرنا ہیں۔ لیکن اب فقہی احکام انہیں کہا جاتا ہے جن میں غور وفکر حرام ہے۔

شخصیت پرستی:

فقہ کے احکام، انسانوں کے مرتب کردہ تھے۔ وہ حضرات (فقہا) کتنے ہی بلند مرتبہ بزرگ اور ماہرین قوانین کیوں نہ ہوں، لیکن تھے تو بالآخر انسان ہی۔ اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے قوانین (کلمات اللہ) کو غیر متبدل قرار دیا ہے۔ (6:116) لہٰذا، انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل قرار دینا، انہیں خدائی درجہ دے دینا ہے جو بالبداہت شرک ہے۔ قرآن کی بنیادی حقیقت یہ بھی ہے کہ اس نے شخصیتوں کو ختم کر کے، صرف خدا کی حاکمیت کو باقی رکھا۔ دیکھئے، وہ کس قدر واشگاف الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ (3:79)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔۔۔ خواہ اسے مقنّنہ کے اختیارات حاصل ہوں اور خواہ انتظامیہ کے۔ حتیٰ کہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو۔ کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیے کہ تم اس کتاب کی محکومیت اختیار کر کے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو، اور جس پر تم غور وخوض کرتے ہو، اللہ والے بن جاؤ۔

انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو ابدی (غیر متغیر) قرار دینے میں عملی نقص یہ ہے کہ ہزار سال پہلے کے زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے وضع کردہ قوانین، اس زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوں تو کرتے ہوں، ہزار سال بعد کے زمانے کے تقاضوں کو کبھی پورا نہیں کر سکتے۔ وہ اس قدر بدلے ہوئے ماحول میں فٹ ہی نہیں بیٹھ سکتے۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کا تجربہ تو ہم نت نئے دن کرتے رہتے ہیں۔ مسودہ قانون بڑے غور وفکر کے بعد مرتب ہوتا ہے۔ پارلیمان میں سینکڑوں اراکین کے اجلاس میں وہ موضوع بحث بنتا ہے۔ دو دو تین تین دفعہ اسے دہرایا جاتا ہے۔ اس میں کئی ترامیم کی جاتی ہیں۔ حکومت میں ماہرین قانون کا ایک خاص شعبہ، اس کے ایک ایک لفظ کی چھان بین کرتا ہے۔ اتنی چھلنیوں میں سے چھننے

کے بعد، وہ آخری شکل اختیار کرتا ہے۔ لیکن ہنوز وہ پریس میں ہوتا ہے کہ اس کی ترمیم شائع کرنی پڑ جاتی ہے۔ یہ ہے انسانی قانون سازی کی کیفیت۔ ہزار سال پہلے تو قانون سازی کے سلسلہ میں اس قدر اہتمامات کا تصور تک نہیں تھا۔ لہٰذا اس زمانے کے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو ابدی طور پر غیر متبدل قرار دے دینا، عقیدت مندانہ جذبات کی تسکین تو کر سکتا ہے، عملی زندگی میں ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔

ابتداءً، فقہی قوانین سے اختلاف قابل اعتراض نہیں تھا۔ علامہ اقبالؒ کی تحقیق کی رو سے، چوتھی صدی ہجری کے آغاز تک، قریب انیس مختلف مراکز فقہ وجود میں آ چکے تھے۔ ان میں سے متعدد (حنفی۔ شافعی۔ مالکی۔ حنبلی وغیرہ) اب بھی باقی ہیں۔ لیکن بعد میں جب' اسلاف کے مسلک کے دین بنا دیا گیا اور فکر پر پہرے بٹھا دیئے گئے، تو ہر فرقہ نے اپنی فقہ کو محفوظ اور مستحکم رکھنے کے لیے، اسے مقدس بنا دیا اور اس سے ذرا سے اختلاف کو خلاف اسلام قرار دے دیا۔

آپ شاید دل میں سوچتے ہوں کہ جب اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ ان قوانین کے واضعین بہر حال انسان تھے، تو ان کے وضع کردہ قوانین کو یہ حیثیت دی کیسے گئی؟ یہ نقطہ نظر واقعی اہم ہے اور گہرے غور و فکر کا محتاج! انہیں یہ حیثیت اس طرح حاصل ہوگئی کہ ان کے متعلق کہا گیا کہ یہ قوانین ان فقہا کے خود وضع کردہ نہیں بلکہ نبی اکرم ﷺ کے ارشادات (حدیث) پر مبنی ہیں۔ لہٰذا ان قوانین سے اختلاف یا ان کا انکار، احادیث یا سنت رسول اللہ ﷺ سے انکار سے مرادف ہے۔ اور یہ کفر ہے۔ ان قوانین کی حضور ﷺ کی طرف نسبت سے، اب سوال فکر سے متعلق نہ رہا، جذبات سے وابستہ ہو گیا۔ اور جو سوال، جذبات سے وابستہ ہو جائے، اس کی تقدیس، تنقید کی حد سے ماورا ہو جاتی ہے۔ یہ مقام بڑا نازک ہوتا ہے۔

عزت بخاری؟ کے الفاظ میں:

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید، جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

منکرِ حدیث:

نتیجہ اس کا یہ کہ جونہی کسی نے کسی فقہی فیصلہ سے اختلاف کیا، یا اس پر اعتراض کیا، اس کے متعلق مشہور کر دیا کہ وہ منکر حدیث ہے، منکر رسول اللہؐ ہے۔ اس سے عوام کے جذبات جس قدر مشتعل ہو سکتے ہیں، ظاہر ہے۔ یہ ہے وہ ٹیکنیک جس سے فقہی عقائد و احکام کو تنقید کی حد سے بالا تسلیم کرایا جاتا ہے۔

یہ واقعی بڑا نازک مقام ہے۔ لیکن میں کوشش کروں گا کہ ان حضرات کے جذبات کی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے، یہ واضح کروں گا کہ انکار حدیث یا انکار رسالت کی حقیقت کیا ہے، اور جسے حدیث یا سنت رسول اللہؐ سے انکار کہا جاتا (یا مشہور کیا جاتا) ہے وہ درحقیقت کس چیز کا انکار ہوتا ہے۔ اس مقام پر میرا مخاطب وہ طبقہ ہے جو سوچ سے کام لینا چاہتا ہے، نہ کہ وہ جذبات میں بہہ جانا چاہتا ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العظیم۔

(جاری ہے)

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قسط نمبر 17

پرویز صاحب کا نظریۂ اسلامی مملکت

(قرآنی حکومت)

اور جو لوگ ما انزل اللہ (قرآن) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی لوگ کافر، ظالم، فاسق ہیں (47-45-44:5)

اسلامی حکومت کا سرسری نقشہ

طلوعِ اسلام:

نومبر 1980ء، صفحہ نمبر 57: ''(1)۔ قرآن کریم کی تعلیم کا نقطہء ماسکہ ''تکریمِ انسانیت'' ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70)۔ یعنی ہر انسانی بچہ، محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں احترام اور تکریم کا مستحق ہے۔ اس بنیادی اصول کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم (اور محتاج) بنانے کا حق حاصل نہیں، کیونکہ محکومیت میں شرفِ آدمیت (احترامِ انسانیت) باقی نہیں رہتا۔ قرآن کریم نے اسے بیّن الفاظ میں واضح کر دیا ہے کہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔۔۔(3:79)۔ ''کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔۔ خواہ وہ قانون ساز ہو اور خواہ انتظامیہ کا ذمہ دار۔ حتیٰ کہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو۔۔ کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ (اللہ کا محکوم کیسے بنا جائے گا، اسے آیت کے اگلے ٹکڑے میں بتا دیا گیا ہے جسے بعد میں درج کیا جائے گا)۔ (2) حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (12:40) ''حکومت صرف خدا کے لئے ہے۔'' وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝ (18:26)۔ ''وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔'' (3) لیکن خدا کی ذات تو ہمارے قیاس و گمان و وہم و تصور سے بھی ماوراء ہے۔

قانون کی حکمرانی:

اس کی محکومیت کیسے اختیار کی جائے؟ محکومیت تو کسی محسوس اتھارٹی کی اختیار کی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے اس نے فرما دیا کہ، میری محکومیت، میری کتاب کی اطاعت کی رو سے اختیار کی جا سکتی ہے جو محسوس شکل میں تمہارے پاس موجود ہے۔ کتاب کے معنی ہیں قوانینِ خداوندی جو اس میں درج ہیں۔ غور فرمائیے! قانون کی حکمرانی (Rule of the law) کا نظریہ قرآن کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے انسانوں کو دیا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا: فَاحْكُمْ

بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48)۔ ''ان کے امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرلیا کرو۔'' اوراس کا اعلان (حضور ﷺ کی لسان مبارک سے) ان الفاظ میں کرا دیا کہ: اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ط (6:114)۔ ''کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو اپنا ''حاکم'' تسلیم کرلوں حالانکہ اس نے تمہاری طرف اپنی ''واضح کتاب'' نازل کردی ہے۔'' اس سے واضح ہوگیا کہ اسلام میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہوگی۔ ہم نے پہلے (آیت نمبر 3:79) میں اس ارشادِ خداوندی کو درج کیا تھا کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنا لے۔ اس کے بعد ہے: وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ (3:79)۔ ''اسے کہنا یہ چاہیئے کہ آؤ! ہم سب مل کر ربّانی بن جائیں اس کتاب کے ذریعے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو، اور اس پر غور وخوض کے بعد اس کی غایت اور مقصد تک پہنچتے ہو۔'' اس سے واضح ہے کہ اسلامی حکومت وہ ہے جس میں حکمرانی خدا کی کتاب کی ہو۔ نہ کہ کسی انسان کی۔ کفر و اسلام میں یہی حدِ فاصل ہے۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (5:44)۔ ''جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔''

قانون سازی:

یہ ہے اسلامی اور غیر اسلامی حکومت کا معیار اور مدار۔ اور دونوں میں تفریق وتمیز۔۔۔ لیکن قرآن کریم کی صورت یہ ہے کہ اس میں ایسے احکام، جن کی جزئیات بھی اس نے خود ہی متعین کردی ہوں، بہت کم ہیں۔ باقی سب زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اصول واقدار ہیں۔۔ ان کی تفصیلات قرآن کریم نے خود متعین نہیں کیں۔ جس کتاب کو قیامت تک، اور تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطہء حیات بننا تھا، اسے ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ یہ اصول و اقدار وہ حدود (Boundary Lines) ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانہ کی اسلامی مملکت، وہ ضوابط وطریق کار وضع کرتی ہے جن کے مطابق اصول و اقدارِ خداوندی بروئے کار لائے جاسکیں۔۔ یہ اصول واقدار غیر متبدل ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔: وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ط لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ ۔۔۔ (6:115)۔ ''تیرے رب کے قوانین صدق اور عدل کی بنیادوں پر مکمل ہو گئے۔ اب ان میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔'' لہٰذا، کسی حکومت کو اس کا اختیار نہیں ہوگا کہ ان حدود میں کسی قسم کی تبدیلی یا حک و اضافہ کرسکے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مکمل بھی کردیا ہے اور محفوظ بھی: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (15:9)۔ ''ہم نے اس کتاب کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔'' اس لئے اسے کوئی ضائع بھی نہیں کرسکے گا۔۔ جو کچھ اس میں کہا گیا ہے۔

وہ بالکل واضح اور روشن ہے: وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۔۔۔ (16:89)۔ ''ہم نے (اے رسول ﷺ) تجھ پر یہ ایسی کتاب نازل کی ہے جو اپنے مندرجات کو نہایت وضاحت سے بیان کرتی ہے۔'' لہٰذا، وہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کی تاویلوں اور تعبیروں میں اختلاف ہوگا، وہ قرآنی تعلیم سے عدم واقفیت کی دلیل ہے۔۔ قرآن کی تعلیم واضح اور غیر مبہم ہے۔ اور اس میں کسی قسم کا تضاد نہیں۔ یہ خصوصیت بھی اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ط

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (4:82)۔ ''کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے؟۔ اگر یہ غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں بکثرت اختلافات اور تضادات پاتے۔''۔۔۔۔۔ یہ ہیں وہ حدود جنہیں محفوظ رکھنا، اُمتِ مسلمہ کا فریضہ قرار دیا گیا۔ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ (9:112) مومنین کی خصوصیت بتائی گئی۔۔۔ آپ نے غور فرمایا کہ اسلامی مملکت میں کسی کو حقِ حکومت حاصل ہی نہیں ہوتا۔ اس میں امت کا فریضہ حدود اللہ کی نگہداشت اور محافظت ہوتا ہے ، اور اربابِ حل وعقد کا فریضہ، احکام و اصول و اقدارِ خداوندی کے اجراء اور تنفیذ کے لئے طور طریق وضع کرنا۔ انہیں آپ جزئی یا فرعی قوانین۔۔ (Bye laws) کہہ لیجئے۔ وہ یہ فریضہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دیں گے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے جزئی اور فرعی قوانین میں سے کوئی بھی ان اصول و اقدار سے ٹکرائے گا نہیں۔ انہی کی روشنی میں اس حکومت کا داخلی نظم ونسق بھی برقرار رکھا جائے گا اور بیرونی تعلقات کی پالیسی بھی مرتب کی جائے گی۔۔ قرآن کریم ایسی جامع کتاب ہے کہ زندگی کا کوئی معاملہ ایسا نہیں جس کے لئے اس میں اصولی راہنمائی موجود نہ ہو۔۔ اس لئے اس حکومت کو، ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، امورِ مملکت کے سرانجام دینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ حکومت کے وضع کردہ یہ فرعی قوانین زمانے کے حالات کے مطابق بدلتے رہیں گے لیکن وہ حدود اپنی جگہ مستقل اور غیر متبدل رہیں گی۔ ثبات اور تغیر کے اس حسین امتزاج سے، کاروانِ انسانیت اپنی منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں رہے گا۔۔۔ قرآن کریم کی رو سے، مملکت کسی خاص گروہ یا جماعت کی وراثت یا ملکیت نہیں ہوتی۔ یہ پوری کی پوری امت کو ملتی ہے۔ کیونکہ انہی کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ ہوتی ہے (24:55)۔۔۔ اس لئے حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے، امورِ مملکت، اُمت کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔۔ اس مشاورت کا سب سے پہلے حکم خود حضور نبی اکرم ﷺ کو دیا گیا (3:158)۔ اور جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38)۔ ''ان کی مملکت کے امور ان کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔''

قرآنی مشاورت:

قرآن کریم نے مشاورت کا اصول دیا ہے جو غیر متبدل ہے۔ اس مشاورت کی مشینری خود وضع نہیں کی۔ اسے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ بہ تقاضائے حالات، جس قسم کی مشینری مناسب سمجھے وضع کر لے۔ ہمارے ہاں کے دانشور حضرات جو یہ تحقیق کرنے کے لئے خواہ مخواہ مغز کھپا رہے ہیں کہ اسلام کی رو سے انتخابات کس طرح ہوں گے۔ ووٹرز کی خصوصیات کیا ہوں گی۔ مجلسِ قانون ساز کا نظام پارلیمانی ہوگا یا صدارتی۔ مرکز مضبوط ہوگا یا صوبجاتی خود مختاری ہوگی۔ یہ بے معنی بحثیں ہیں۔ ان امور کو اسلامی مملکت، خود اپنے حالات کے تحت طے کرے گی۔ جو طریق بھی وہ مناسب سمجھے وہ ''اسلامی'' ہوگا۔ بشرطیکہ وہ قرآن کے کسی اصول (حدود اللہ) سے نہ ٹکرائے۔ مغربی جمہوریت اس لئے خلافِ اسلام ہے کہ اس میں قانون سازی کے غیر محدود اختیارات انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں، جو قرآن کی رو سے شرک ہے۔۔ قرآنی مشاورت اس لئے اسلامی ہوگی کہ اس میں جملہ امورِ مملکت پر حدود اللہ کا کنٹرول ہوگا۔۔ یہ ہے بنیادی فرق اسلامی اور غیر اسلامی نظامِ زندگی، اور

اسلامی مشاورت اور مغربی جمہوریت میں۔۔۔اب آیئے سیاسی جماعتوں اور مذہبی فرقوں کے وجود کی طرف۔

اقوامِ عالم کی نگران اُمّت:

قرآن کریم کا منتہائے نگاہ، تمام نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری کے رشتے میں منسوط کرنا ہے۔آغازِ کار کے لئے اس نے ایک امت کی تشکیل کی۔جس نے نسل، رنگ، زبان، وطن، مذہب وغیرہ کے اختلافات کو ختم کر کے صرف ایمان (آئیڈیالوجی) کی بنیادوں پر ایک برادری کی شکل اختیار کی۔ارشادِ خداوندی ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (2:143)۔''اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا۔تمہارا نظام یہ ہوگا کہ تم اقوامِ عالم کے اعمال و کردار کی نگرانی کرو اور تمہارا رسول ﷺ تمہارے اعمال و کردار کا نگران ہو۔'' اس امت کے متعلق دوسرے مقام پر ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3:110)۔''تم وہ بہترین امت ہو جسے نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم ان امور کو نافذ کرو جنہیں ضابطہءخداوندی جائز قرار دیتا ہے اور ان امور پر پابندی عائد کرو جنہیں وہ معیوب ٹھہراتا ہے۔''

تفرقہ:

اس امت سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (3:103)۔''تم، تمام کے تمام، اجتماعی طور پر، وحیءخداوندی (کتاب اللہ) کو مضبوطی سے تھامے رہو، اور باہمی تفرقہ مت پیدا کرو''۔۔یعنی تشکیلِ امت کے بعد، پہلی چیز جس کی انہیں وارننگ دی گئی، یہ تھی کہ وہ تفرقہ پیدا نہ کریں۔فرقوں اور پارٹیوں میں نہ بٹ جائیں۔۔۔اس نے فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ جانے کو مشرکین کا شیوہ بتایا جب کہا کہ: ولا تکونوا من المشرکین۔من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً کل حزب بما لدیھم فرحون (30-32:24)۔''دیکھنا! تم ایمان لانے کے بعد پھر سے مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور اس طرح فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ گئے۔پھر ان کی کیفیت یہ ہوگئی کہ ہر فرقہ (حزب) اس زعمِ باطل میں مبتلا ہو گیا کہ ہم حق پر ہیں، اور باقی سب باطل پر''۔۔یہاں اس نے امت میں فرقہ بندی اور پارٹی بازی کو شرک قرار دیا ہے۔۔دوسری جگہ اسے کفر اور عذابِ عظیم کا موجب بتایا ہے۔فرمایا: وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ (3:105)۔''اے جماعتِ مومنین! دیکھنا! کہ تم بھی کہیں ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے واضح تعلیمِ خداوندی کے آجانے کے بعد باہمی اختلاف کیا اور فرقوں میں بٹ گئے۔اس کا نتیجہ بہت بڑی تباہی ہوگا۔'' آخر میں کہا کہ: اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ (3:106)۔''کیا تم ایمان لانے کے بعد پھر کفر اختیار کر لو گے۔''یعنی ایمان کی مظہر تو وحدتِ امت تھی۔وہ وحدت نہ رہے تو ایمان باقی نہیں رہتا، کفر آجاتا ہے۔اس نے حضور نبی اکرم ﷺ سے فرما دیا کہ:

اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَکَانُوۡا شِیَعًا لَّسۡتَ مِنۡہُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ ؕ (6:159)۔ ''جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور خود ایک پارٹی بن جائیں، اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔'' ۔۔۔ ہم پوچھتے ہیں اربابِ علم و بصیرت سے کہ کیا قرآن کریم کے ایسے واضح اور بیّن ارشادات کے بعد، ایسا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی معاشرہ، نظام یا حکومت میں، فرقوں اور پارٹیوں کی گنجائش ہے۔۔۔؟

تعمیرِ مسجد:

فرقہ بندی اور اسلام کس طرح ایک دوسرے کی ضد ہیں، قرآن کریم نے اس کی وضاحت ایک عملی مثال سے بھی کر دی۔ مدینہ میں بعض لوگوں نے ایک مسجد تعمیر کی۔۔۔ مسجد کا تعمیر کرنا اجرِ عظیم کا مستوجب قرار دیا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عمل کو کفر قرار دیا۔ اس مسجد کو جہنم سے تعبیر کیا۔ اور رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ تم اس میں قدم تک نہ رکھنا!۔ وہ کیا بات تھی جس کی وجہ سے ایک مسجد اور اور اس کی تعمیر اس قدر غضبِ خداوندی کا موجب بن گئی؟۔ وہ بات یہ تھی کہ وہ مسجد وَّتَفۡرِیۡقًۢا بَیۡنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (9:107)۔ ''اُمت میں تفرقہ پیدا کرنے کا موجب تھی۔'' اس لئے کہا کہ وہ مسجد نہیں: وَاِرۡصَادًا لِّمَنۡ حَارَبَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ مِنۡ قَبۡلُ ؕ (9:107)۔ ''خدا اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں کی کمین گاہ تھی۔'' ۔۔۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں ہمیں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم کی ایسی واضح تنبیہات کے علی الرغم اگر کوئی سمجھتا ہے کہ فرقوں اور پارٹیوں کی موجودگی میں بھی کوئی معاشرہ یا نظامِ حکومت اسلامی کہلا سکتا ہے تو اس سے ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟۔۔ عابد صاحب (صاحبِ استفسار) کے ذہن میں کچھ ایسا نقشہ ہے کہ صدرِ اوّل میں جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تھی تو اس کے ایوانِ پارلیمان میں ایک طرف (حضرت) ابوبکرؓ اور عمرؓ مسندِ اقتدار پر متمکن تھے اور ان کے بالمقابل (حضرت) عثمانؓ اور علیؓ (معاذ اللہ) حزبِ اختلاف کی بنچوں پر براجمان۔ اور ان دو پارٹیوں (احزاب) میں وہ کچھ ہوتا تھا جو دنیا کے ایوانات پارلیمان میں آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ اُس میں یہ نقشہ نہیں تھا۔ قرآن کریم نے دو احزاب ہی کا ذکر کیا ہے۔ یعنی حِزۡبَ اللّٰہِ اور حِزۡبَ الشَّیۡطٰنِ (58:19-22)۔ حزب اللہ ایک ہی پارٹی (امتِ واحدہ) تھی۔ یہ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ (48:29) کی پارٹی تھی۔ اور حزبِ مخالف، ابوجہل اور ابولہب کی پارٹی۔ حزب اللہ کے اندر مختلف احزاب (پارٹیوں) کا تو وہاں تصور تک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔ اسلام میں حکومت، (یعنی خدا کی طرف سے عائد کردہ فرائض کی ادائیگی) پوری کی پوری امت کی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی مجلسِ مشاورت (پارلیمان) بھی امتِ واحدہ ہوتی ہے۔

قرآن، سب کا آئین:

قرآن مجید ان سب کا آئین ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے پر نکتہ چینی نہیں کرتے۔ زیرِ نظر معاملہ پر قرآن کی روشنی میں غور و فکر کرتے ہیں۔ اپنی اپنی آراء کا بلا خوف و خطر اظہار کرتے ہیں۔ اس کے بعد جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ قانونِ شریعت کی

شکل میں اُمت پر نافذ ہوجاتا ہے۔۔اس میں ''اربابِ حکومت'' اور عوام میں کوئی تفریق نہیں ہوتی، اس قانون کا اطلاق سب پر یکساں ہوتا ہے۔اس میں پرسنل لاز اور پبلک لاز کی بھی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ یہ تفریق سیکولر نظامِ حکومت کی پیدا کردہ ہے۔چونکہ امت میں کوئی فرقہ نہیں ہوتا اس لئے'' مختلف فرقوں کی اپنی اپنی فقہ'' کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔مرکزی حکومت، انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر، ملک کو مختلف قطعات میں تقسیم کرسکتی ہے۔۔مرکز کے نمائندگان جو ان علاقوں میں قوانینِ شریعت کی تنفیذ کے فرائض سرانجام دیں گے، انہیں قرآن کریم میں ''اولی الامر'' کہہ کر پکارا گیا ہے۔۔وہاں کے لوگوں کو ان ''اولی الامر'' (افسرانِ ماتحت) سے اختلاف ونزاع کا حق حاصل ہوگا، اور اس کے تصفیہ کے لئے معاملہ زیرِنظر کو مرکزی حکومت کی طرف (Refer) کیا جائے گا۔مرکز اس کا فیصلہ قرآن کریم کی روشنی میں کرے گا۔ارشادِ خداوندی ہے:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (42:10)۔''اختلافی امور کا فیصلہ کتاب اللہ کی رو سے کیا جائے گا۔''

قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا؟:

طلوعِ اسلام جنوری 1970ء، ص:71 ''طلوعِ اسلام جس قسم کا معاشرہ قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے اس میں:

(1) ہر شخص کی عزت، بلاتمیز مذہب، رنگ، نسل، پیشہ محض انسان ہونے کی جہت سے ہوگی۔کسی کو پست یا ذلیل نہیں سمجھا جائے گا۔ برتری کا معیار یہ ہوگا کہ کوئی شخص قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کس قدر محنت اور دیانت سے کام لیتا ہے۔اس کا کیریکٹر کیسا ہے اور وہ نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچانے کی خاطر کیا کرتا ہے؟۔

(2) کوئی شخص بے کس ولاچار اور بے یارومددگار نہیں ہوگا۔ ہر ایک کی بات سنی جائے گی۔اور تکلیف رفع کی جائے گی۔ ہر شخص کو انصاف ملے گا اور بغیر کچھ خرچ کئے ملے گا۔کوئی صاحبِ اثر، انصاف کے پلڑے کو اپنی طرف نہیں جھکا سکے گا۔

(3) کوئی فرد بھوکا، ننگا یا بے گھر نہیں رہے گا۔تمام افراد کے لئے خوراک، لباس اور مکان وغیرہ بنیادی ضروریاتِ زندگی کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہوگا۔

(4) معاشرہ کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ہر شخص کی تعلیم وتربیت اور (بوقتِ ضرورت) علاج معالجہ کا تسلی بخش اور بلا معاوضہ انتظام کرے۔تعلیم وتربیت کا منشاء حصولِ علم کے علاوہ، فرد کی ذات کا استحکام اور اس کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، معاشرہ کا وجود فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوگا۔''فرد'' میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں اور سفرِ زندگی میں دوش بدوش چلنے کے قابل۔

(5) ہر شخص اپنی پوری استعداد اور محنت سے کام کرے گا۔صرف وہ افراد کام نہیں کریں گے جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہوگئے ہوں۔ یہ نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ تو محنت کرتے کرتے ہلکان ہوجائیں اور کچھ لوگ ان کی کمائی پر مفت میں عیش اڑائیں۔

(6) ہر شخص اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے گا جس سے اس کی مناسب ضروریات پوری ہوں۔باقی سب حاجتمندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے نظامِ مملکت کی تحویل میں دے دے گا۔اور عندالضرورت

دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دے گا۔ کیونکہ انسانی ذات کی نشوونما کا یہی طریق ہے۔ یہ سب کچھ قرآنی نظام کے ذریعے عمل میں آئے گا۔

(7) رزق کے سرچشمے (خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا کارخانوں کی صورت میں) امت کی تحویل میں رہیں گے۔ تاکہ وہ افرادِ معاشرہ کی پرورش کے کام آئیں۔ قرآنی نظام انہیں نظم ونسق کی خاطر، بطور امانت افراد کے سپرد کردے گا۔ جب افراد کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہوگی اور رزق کے سرچشمے حاجتمندوں کے لئے کھلے رہیں گے تو کسی کے لئے دولت سمیٹ کر جمع کرنے اور جائیدادیں بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

(8) ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کے احکام (قرآن کریم) کے مطابق ہوگا نہ کہ کسی خاص گروہ یا طبقہ کی مرضی کے مطابق۔ (اس میں گروہوں اور پارٹیوں کا وجود ہی نہیں ہوگا) اس لئے اس معاشرہ میں نہ کسی قسم کا جَور ہوگا نہ استبداد۔ نہ ظلم ہوگا نہ زیادتی۔

(9) ہر شخص کھل کر بات کرے گا۔ اس کے دل میں نہ کسی کی طرف سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہوگا نہ کسی کو نقصان پہنچانے کا خیال۔ ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ ہوگا۔ اور دھوکا اور فریب کی گنجائش نہیں ہوگی۔ اس طرح گھروں کے اندر سکون اور معاشرہ کے اندر اطمینان ہوگا۔

(10) یہ سب کچھ اس لئے ہوگا کہ ہر شخص قوانینِ خداوندی کے محکم اور مکافاتِ عمل کے اٹل ہونے پر یقین رکھے گا۔ یہ معاشرہ قائم ہی انہی بنیادوں پر ہوگا۔

(11) اس معاشرہ میں نظامِ حکومت، کمیونزم کی ڈکٹیٹرشپ یا مغرب کی لادینی جمہوریت یا تھیاکریسی کی بجائے خالص قرآنی اصولوں کے مطابق قائم ہوگا۔''

نہ خوف نہ حزن:

طلوعِ اسلام مارچ 1970ء، ص:18 ''قرآن نے جماعتِ مومنین کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ انہیں نہ خوف ہوگا نہ حزن (2:38)۔ خوف، خارجی خطرات سے ہوتا ہے اور حزن، دل کی افسردگی اور پریشانی کو کہتے ہیں۔ لہٰذا، قرآنی مملکت کا فریضہ ہوگا کہ وہ مملکت میں ایسی فضا پیدا کردے جس میں کسی شریف انسان کو نہ کسی قسم کا خوف لاحق ہو، نہ حزن گلوگیر۔ اسے نہ کسی سے کوئی ڈر ہو اور نہ ہی کوئی پریشانی۔۔۔ ڈر ہو تو صرف قانون کی خلاف ورزی کے نتائج کا۔ اور پریشانی ہو تو اس وقت جب اس نے کسی مستقل قدر (Permanent Value) کو پامال کرکے، اپنی ذات کو اپنے ہاتھوں نقصان پہنچایا ہو۔''

طلوعِ اسلام فروری 1972ء، ص:44، ''وہ دوسری سلیں جنہوں نے انسان کو بری طرح کچل کر رکھ دیا تھا، چکی کے پاٹ تھے۔۔ یعنی روٹی کی فکر۔ قرآنی مملکت نے انسان کو اس فکر سے آزاد کرکے، اس محبوس قفس طائرِ لاہوتی کو آزادی کی حقیقی فضاؤں میں اذنِ بال کشائی دے دیا۔ جس سے اسے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی۔ قرآن کریم نے قرآنی مملکت کی

خصوصیتِ کبریٰ یہ بتائی ہے کہ اس میں افرادِ معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ: فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔یعنی وہ ہر قسم کے خوف اور حزن سے مامون ہوں گے۔خوف کے معنی تو ہم سمجھتے ہیں۔۔کسی آنے والے خطرہ کے احساس سے ہراساں۔۔قرآنی مملکت میں کس قدر بے خوفی اور امن ہوتا ہے،اس کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نظام قائم کروں گا جس میں حالت یہ ہوگی کہ یمن سے ایک عورت تنہا،صحراؤں اور بیابانوں سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلی جائے گی اور اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔۔۔بے خوفی اور امن کے ماپنے کا اس سے بہتر پیمانہ اور کیا ہوسکتا ہے۔۔۔باقی رہا وہ خوف جو زیر دستوں کو بالا دستوں کی طرف سے ہر وقت وجہ ءسوہانِ روح ہوتا ہے۔۔سو اس کے متعلق وہ واقعہ سامنے لایئے کہ حضرت عمرؓ ایک دفعہ ایک وادی میں سے گزر رہے تھے کہ آپ نے یکا یک سواری کو روکا، نیچے اترے،اور سجدے میں گر گئے۔رفقاء نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا تو فرمایا کہ یہ وہ وادی ہے جس میں عمرؓ اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا،اور سہمے سہمے پھرا کرتا تھا۔باپ بھی سخت تھا اور یونہی بات بات پر پیٹ دیا کرتا تھا۔ایک وہ دن تھا،اور ایک یہ دن ہے کہ عمر اور اس کے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں جس سے ڈرا جائے۔۔یہ وادی دیکھ کر مجھے یہ احساس اس شدت سے ہوا کہ میں بے اختیار بحضور رب العزت سجدہ میں گر گیا۔۔۔یہ ہوتا ہے قرآنی مملکت میں بے خوفی کا عالم۔اس میں،خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوتی جس سے ڈرا جائے۔۔خدا کا ڈر بھی کسی مستبد حاکم کا ڈر نہیں ہوتا۔خدا کے ڈر سے مراد ہوتا ہے اس نقصان اور تباہی کا احساس جو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔مثلاً جس طرح ہم دریا کے کنارے چلتے ہوئے،پاؤں پھسلنے کے انجام سے ڈرتے ہیں۔۔قرآنی مملکت میں قانون شکنی کے نقصان رساں نتائج کے احساس کے علاوہ اور کسی قسم کا خوف کسی کو نہیں ستاتا۔۔۔باقی رہا ''حزن''۔تو یہ لفظ بڑے گہرے معانی کا حامل ہے۔عام طور پر اس کے معنی افسردگی اور اندوہ ناکی ہوتے ہیں۔خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔لیکن اسے بالخصوص اس افسردگی اور غمگینی کے لئے بولا جاتا ہے،جو معاشی پریشانی کی وجہ سے حائل ہو۔سورہ ءفاطر میں جنتی معاشرہ میں بسنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آئیں گے کہ:۔۔۔ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ط۔کس قدر قابلِ حمد وستائش ہے خدا (کا وہ نظام) جس نے ہمیں حُزن سے نجات دلائی۔عربی زبان کے مستند لغت ''تاج العروس'' میں لکھا ہے کہ یہاں حُزن کے معنی ہیں صبح وشام کے کھانے کی فکر۔اس کی تشریح خود اگلی آیت نے کر دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: اَلَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ (35:34-35)
وہ خدا جس نے اپنے فضل وکرم سے ہمیں ایسا معاشرہ عطا کر دیا ہے جس میں نہ کوئی جگر پاش مشقت ہے،نہ ذہنی کاوش ونفسیاتی افسردگی۔نہ اس میں روٹی کے لئے مارے مارے پھرنا پڑتا ہے اور نہ ہی باہمی معاملات میں اس قسم کا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان خواہ مخواہ پریشان رہے۔۔فکرِ معاش کی طرف سے آسودگی اور باہمی خوش معاملگی،یہ ہیں قرآنی مملکت کی بنیادی برکات وحسنات۔''

انسانیت کے لئے نفع بخش:

طلوعِ اسلام جنوری 1983ء، صفحہ نمبر 62: ''جب مملکت دین کے تابع رہے تو نوعِ انسان کے لئے آیہء رحمت ہوتی ہے۔ اور جب دین سے الگ ہو جائے تو تباہیوں کا موجب۔ طرزِ حکومت کے بدلنے سے اس میں کچھ فرق نہیں آتا ؎

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ مثالی مملکت قائم ہوتی ہے مستقل اقدار کی بنیادوں پر، اور اس کی بقا کا راز، اس غیر متبدل ابدی اصول میں ہوتا ہے کہ: ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (12:17)۔ ''بقا اسی عمل کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو''، کسی خاص جماعت۔ خاص پارٹی۔ خاص گروہ۔ خاص ملک۔ خاص قوم کے لئے نفع بخش نہیں بلکہ پوری کی پوری انسانیت کے لئے نفع بخش۔ حتیٰ کہ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی کوئی تمیز نہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اس مملکت کی نفع رسانیوں سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ اس میں غیر مسلموں کی جان۔ مال۔ عزت۔ آبرو ہی کی حفاظت نہیں بلکہ ان کی پرستش گاہوں تک کی حفاظت بھی مملکت کا فریضہ ہوتی ہے۔ اور ہر ایک کے معاملات عدل و انصاف کی رو سے طے پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس حکم کی تعمیل میں اس کا فریضہ ہوتا ہے کہ: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ (5:8)۔ ''کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ یہی روش تقویٰ سے قریب تر ہے۔'' پروفیسر (J.D.Mabbot) نے کہا تھا کہ:۔ اچھی حکومت اسے کہنا چاہیئے جس میں تمام افراد کی حفاظت ہو۔ کسی کو کسی سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ ہو۔ باہمی معاملات میں خوشگواری ہو۔ اور افراد کے تنازعات کے فیصلے عدل کی رو سے کئے جا سکیں۔ (بحوالہ: The State and the Citizens)۔ قرآنی تصور کے مطابق قائم شدہ مملکت، ان تمام شرائط پر پوری اترتی ہے۔ یہی وہ مملکت ہوتی ہے جس کے انسانیت ساز اور زندگی بخش نتائج سے دنیا دیکھ لیتی ہے کہ ذہنِ انسانی کے تجویز کردہ نظامِ حکومت اور وحی کے خطوط پر متشکل مملکت میں کیا فرق ہوتا ہے۔۔ وہی فرق جس کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ ؎

مملکت لا دیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

(جاری ہے)

رسالہ نہ ملنے کی صورت میں مندرجہ ذیل نمبرز پر رابطہ کریں شکریہ
Cell: 0321-4460787 Phone: 042-35714546

ڈاکٹر شاکر حسین خان
ورٹنگ فیکلٹی ممبر شعبہ علومِ اسلامی جامعہ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنِ کریم کی خصوصیات قرآنِ کریم کی روشنی میں

قرآن کریم صحیفہ آسمانی، پیغام ربانی اور کلامِ لاثانی ہے، اس کی خصوصیات کا کیا کہنا اس عنوان کے تحت قلم اٹھانا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، قرآن کریم جو کہ تمام علوم کا سمندر ہے اور اس کی آیاتِ بینات انمول موتی ہیں جو کہ اس کی سورتوں میں جگمگ جگمگ کر رہی ہیں۔ ان کی ضیاء سے اہل ذکر یعنی طالبانِ قرآن کے دل منور ہو رہے ہیں۔ اس کتاب آسمانی کی سب سے بڑی خاصیت یہی ہے کہ اس کی آیات طیبات اس کلام کی خصوصیات خود بیان کر رہی ہیں۔ ان میں سے چند آیتیں ملاحظہ ہوں:

سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ (2:2)

''یہ ذی شان کتاب ذرا شک نہیں اس میں۔''

اس کتاب کی صداقت اور اس کے کلام ربانی ہونے میں ذرا برابر بھی شک نہیں کیا جا سکتا۔ جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری صحیفۂ الہامی کی اس خاصیت کے حوالے سے آیت مذکورہ کے تحت رقم طراز ہیں:

''اس کے واضح دلائل اس کی روشن تعلیمات اس کے بیان کردہ تاریخی واقعات اور اس کی پیشین گوئیاں، حق وصداقت کے وہ بلند مینار ہیں جہاں شک وشبہ کا غبار نہیں پہنچ سکتا۔ اگر کوئی شبہ کرتا ہے تو یہ اس کی اپنی کج فہمی اور کور ذوقی ہے اگر یرقان کے بیمار کو ہر چیز زرد دکھائی دے تو یہ اس کی آنکھوں کا قصور ہے، ہر چیز تو زرد نہیں۔''

انسان کی اپنی عقل وشعور پر مبنی اس کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی تحریرات میں تو غلطی کا بھی امکان ہے اور اس کی تصانیف وتالیفات میں غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ انسانوں کا آپس میں اختلاف رائے ہوتا ہے۔ ان کے خیالات ونظریات مختلف ہوتے ہیں اس لیے انسان کے اپنے شعور اور علم وآگہی پر مبنی کتابوں میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن قرآن کریم جو کہ کلام ربانی ہے اور کلام بھی ایسا جس کی حفاظت کا ذمہ خود صاحب کلام نے لیا ہے جس کے بارے میں صاحب کلام نے فرمایا:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ (2:2) تو پھر کس طرح ایسے کلام میں یا اس کے کلام ربانی ہونے میں شک کیا جا سکتا ہے؟

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس خاصیت کو قرآن کریم میں متعدد مقامات پر صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ حوالے کے لیے قرآن کریم کی یہ آیت ملاحظہ ہو:

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (26:192)

''اور بیشک یہ خداوند عالم کا اتارا ہوا ہے۔''

جبریل الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ، رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے حکم سے اس کلام ربانی کو لے کر دنیا میں تشریف لائے اور اس کو جناب رسول ﷺ کے قلبِ اطہر پر نازل فرمایا۔ ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے کہ جبریل امین علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا پیغام، انبیاء کرام تک پہنچاتے رہے اور اس بات کو علمائے بنی اسرائیل بھی اچھی طرح سے جانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کو نبی آخر الزماں ﷺ تک قائم رکھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ (26:193-194)

''اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے آپ کے قلب پر۔''

قرآن کریم کی ایک اور آیت سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام قرآن کریم لے کر نازل ہوئے۔ آیت قرآنی ملاحظہ ہو:

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (2:97)

''آپ فرما دیجئے جو کوئی دشمن ہو جبریل کا تو اس نے آپ کے دل پر کلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے اتارا ہے۔''

قرآن کریم نے منکرین قرآن کے اس قول کو باطل قرار دے دیا کہ قرآن محمد ﷺ کا خود ساختہ اور غیر خدائی کلام ہے قرآن کریم نے ان کے اس اعتراض کا جواب قرآنی آیات کی صورت میں قرآن کریم کے مختلف مقامات پر مختلف انداز میں دیا ہے۔

ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (53:3-4)

''اور نہیں کہتے اپنے جی سے وہ تو وحی الٰہی ہے جو کی جاتی ہے۔''

یعنی قرآن کریم عین وحی الٰہی ہے اس لیے قرآن نے خود ہی اپنے وحیٔ الٰہی ہونے کا اعلان کر دیا اور غیر خدائی کلام قرار دینے والوں کو کھلم کھلا چیلنج کر دیا کہ اگر تم سچے ہو تو اس جیسا کلام بنا کر لے آؤ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ (17:88)

''اعلان کردو کہ اگر اکٹھا ہوجائیں سارے انسان اور جنات اس پر کہ لے آئیں اس قرآن کی طرح تو نہ لائیں گے ایسا گو ہوجائیں بعض بعض کے پشت پناہ۔''

جب اعتراض کرنے والے اس جیسا کلام مقابلے کے لیے لانے سے قاصر رہے تو قرآن نے انہیں پورا قرآن (ایک سو چودہ سورتیں) لانے کے بجائے صرف دس سورتیں قرآن کریم کی سورتوں کی مثل لانے کی دعوت دی ارشاد ہوا:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ (14-11:13)

ترجمہ: کیا کہتے ہیں کہ گھڑ لی ہے وحی جواب دے دو کہ اس کے مثل دس سورتیں گھڑی ہوئی لے آؤ اور بلا لو جن کی سکت رکھتے ہو اللہ کو چھوڑ کر اگر سچے ہو۔ پس اگر نہ جواب دیں تم کو تو جان لو کہ وہ نازل کیا گیا ہے اللہ کے علم سے۔''

جب معترضین قرآن کریم کی سورتوں کی طرح دس سورتیں نہ بنا سکے تو ارشاد ہوا:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (10:38)

ترجمہ: ''کیا بولی بولتے ہیں کہ اس کو گھڑ لیا ہے۔ تم کہہ دو کہ بنا لاؤ اس کی طرح ایک سورت اور بلا لو جس کو پا سکو اللہ کو چھوڑ کر اگر سچے ہو۔''

اعتراض کرنے والے جب ایک سورہ بھی نہ بنا سکے تو صاحب کلام نے فرمایا:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ؕ (34-52:33)

ترجمہ: ''آیا یہ کہتے ہیں کہ خود ہی بنا لیا ہے اس قرآن کو بلکہ وہی بے ایمان ہیں۔ اچھا تو لے آئیں ایک بات بھی اس کے مثل اگر وہ سچے ہیں۔''

ان آیات سے ثابت ہوا کہ قرآن کریم کلام الٰہی ہے اور اس کی مثل کوئی انسان ایک آیت بھی نہیں بنا سکتا اگر یہ کسی انسان کا بنایا ہوا ہوتا تو دوسرے انسان اس جیسا ایک قرآن تو کیا سینکڑوں قرآن گھڑ لیتے اگر قرآن کسی انسان کا کلام ہوتا تو اس میں متعدد خامیاں پائی جاتیں اور اس کی آیتوں میں باہمی اختلاف پایا جاتا جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ (4:82)

ترجمہ: اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔

آیت مذکورہ کے تحت سید ابوالاعلیٰ مودودی رقم طراز ہیں:

''یہ کلام تو خود شہادت دے رہا ہے کہ یہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کا کلام ہو نہیں سکتا۔ کوئی انسان اس بات پر قادر نہیں ہے کہ سالہا سال تک وہ مختلف معاملات میں مختلف مواقع پر مختلف مضامین پر تقریر کرتا رہے اور اوّل سے آخر تک اس کی ساری تقریریں ایسا ہموار اور یک رنگ متناسب مجموعہ بن جائیں جس کا کوئی جزء دوسرے جزء سے متصادم نہ ہو جس میں تبدیلی رائے کا کہیں نشان تک نہ ملے۔ جس سے متکلم کے نفس کی مختلف کیفیات اپنے مختلف رنگ نہ دکھائیں اور جس پر کبھی نظر ثانی تک کی ضرورت نہ پیش آئے۔''

آسمانی کتابیں قرآن کریم سے پہلے بھی نازل ہوئیں اللہ تعالیٰ نے مختلف ادوار میں مختلف شہروں اور بستیوں میں اپنے نبیوں کو مبعوث فرمایا :وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (16:36) اور ان پر کتابیں نازل کیں وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (57:25) لیکن جن لوگوں کے لیے وہ احکامات کتابی صورت میں بطور وحی الٰہی نازل ہوئے، انہوں نے پیغمبروں کے جانے کے بعد اپنی خواہشات کے مطابق ان الہامی کتابوں میں تحریف کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں ان کتابوں کا نشان نہیں اور اگر وہ کتابیں ہیں بھی تو اپنی اصل حالت میں نہیں ہیں جس طرح نازل ہوئی تھیں۔ انجیل مقدس جس کا ہر سو سال بعد نیا ایڈیشن آتا ہے جو اپنے ہر پچھلے ایڈیشن سے قدرے مختلف ہوتا ہے، تورات جسے عہد نامہ قدیم بھی کہتے ہیں ناپید ہو گئی تھی۔ سید معروف شاہ شیرازی اپنے تحقیقی مقالہ ''قرآن اور دوسری مذہبی کتب'' میں رقم طراز ہیں:

> ''شاہ یہودا کے دور میں تورات گم ہو گئی تھی پورے 75 سال اس کا کوئی پتا نہ چلا۔ پھر شاہ بوسیا کے عہد میں کاہنوں کے سردار خلقیا نے 624ء میں اسے اچانک برآمد کر لیا بعض تحقیق کے مطابق پورے تین سو سال تک گم رہی۔''

قرآن کریم کی خصوصیات میں سے ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ پندرہ سو سال ہو گئے اس کو نازل ہوئے یہ اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اس کتاب میں تحریف نہیں ہوئی اور نہ ہی اس میں اس کی گنجائش ہے اور نہ ہی اس میں شیطان کا عمل دخل ہو سکتا ہے کیوں کہ اس کتاب میں باطل کی آمیزش کی گنجائش نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ (41:42)

''نہیں آ سکتا باطل اس کے آگے اور نہ پیچھے سے اتاری ہوئی حکمت والے حمد والے کی طرف سے۔''

جب قرآن کریم کا نزول ہو رہا تھا اس وقت بھی شیطان کو اس سے دور رکھا گیا تھا اور شیطان کو اس کے چھونے کی بھی اجازت نہیں دی گئی قرآن کریم جو لکھا جاتا ہے ایک محفوظ کتاب میں اسے پاک لوگ چھوتے ہیں۔ یہ بھی قرآن کریم کی خوبی و خاصیت

میں شامل ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا:

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۙ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۙ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ؕ (56:77-79)

''بیشک یہ قرآن ہے بڑی عزت والی ایک کتاب، جو محفوظ ہے۔ اس کو نہیں چھوتے مگر وہی جو پاک ہیں۔''

قرآن کریم کو چھونے اور اس کی تلاوت کرنے کے لیے آدمی کا پاک ہونا ضروری ہے۔ قرآن کریم آسمانی کتابوں میں محفوظ ترین کتاب ہے اللہ تعالیٰ نے اس کلام کی حفاظت کا ذمہ خود اپنے ذمے کرلیا ہے اور رسول اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کو لکھوا کر محفوظ کرلیا تھا۔ اصحاب رسول رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے بھی مزید اس کی کاپیاں تحریر فرمائیں تاکہ قیامت تک کوئی بھی شخص اس کتاب میں سابقہ کتابوں کی طرح تحریف کی جسارت نہ کرسکے۔ قرآن کریم مسلمانوں کے سینوں میں اور تحریری طور پر بھی دنیا کے کونے کونے میں موجود ہے۔ قرآن کریم میں مختلف مقامات پر اس کی حفاظت کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ ایک مقام پر مفصل طور پر بیان کیا گیا ہے آیت ملاحظہ ہو:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (15:9)

''بیشک ہم نے اتارا ہے قرآن اور بلاشبہ ہم ہیں اس کے نگہبان۔''

قرآن کریم کی ایک خاصیت یہ ہے کہ قرآن کریم سابقہ الہامی کتابوں کی تصدیق کرنے والی کتاب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ (2:89)

''اور جب آ گئی ان کے پاس کتاب اللہ کے پاس سے تصدیق کرنے والی اس کی جو ان کے پاس ہے''۔

اور سورۃ المائدہ میں فرمایا:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (5:48)

ترجمہ ''اور اتاری ہم نے تم پر کتاب بالکل حق تصدیق کرتی ہوئی اپنے سے آگے کی کتاب کی اور ان پر نگرانی رکھتی ہوئی''۔

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری سورۃ المائدہ کی آیت مذکورہ میں ذکر کی گئی قرآن کریم کی خصوصیات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''کوئی فعل یا قول اس وقت حق کہلاتا ہے جب کہ وہ اس طرح پایا جائے جیسے چاہیے کہ اس انداز سے پایا جائے جتنا مناسب اور موزوں ہو اور اس وقت پایا جائے جب اس کی ضرورت ہو اس مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب آپ بالحق کے لفظ

کو پڑھیں تو قرآن کی جلالت شان واضح ہوگی۔ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ پہلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور تیسری خصوصیت یہ ہے کہ قرآن ان کتب پر مھیمن بن کر آیا ہے مھیمن متعدد معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ محافظ، نگہبان، نگران، شاہد اور امین، یہاں مھیمن کے یہ سارے معانی لیے جاسکتے ہیں یعنی دین کے وہ عقائد اور اصول جو سابقہ آسمانی کتب میں بیان کیے گئے تھے جن میں سے بعض فراموش کر دیئے گئے اور بعض میں ردوبدل کر کے انہیں کچھ بنا دیا گیا قرآن ان کا محافظ ہے ان کو صحیح رنگ میں پیش کرتا ہے اور اپنے صفحات میں ان کی ایسی حفاظت ونگہبانی کر رہا ہے کہ اب وہاں کسی محرف کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ قرآن آسمانی کتب کا رقیب ونگراں بھی ہے کیوں کہ قرآن ہی ایک کسوٹی ہے جس سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ موجودہ تحریف شدہ آسمانی کتابوں میں حق کی کتنی مقدار جوں کی توں موجود ہے قرآن اس بات پر گواہ بھی ہے کہ یہ کتابیں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء ورسل پر نازل فرمائی تھیں، قرآن امین بھی ہے۔ گزشتہ انبیاء کی تعلیمات کو جوں کا توں پیش کرتا ہے ان میں کسی قسم کا تصرف اور کمی بیشی نہیں کرتا۔''

جس طرح قرآن کریم دیگر الہامی کتابوں کی تصدیق کرنے والی کتاب ہے اس طرح ان کتابوں میں قرآن کریم کا بیان نازل ہوا یا اس کتاب میں وہی احکام موجود ہیں جو دیگر کتابوں میں موجود تھے قرآن کریم میں ارشاد ہوا:

وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ۝ اَوَ لَمْ یَكُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ۝ (26:196-197)

ترجمہ: ''بیشک اس کا بیان اگلی کتابوں میں ہے۔ کیا نہیں ہے ان کے لیے کوئی نشانی کہ جانتے ہیں انہیں بنی اسرائیل کے علماء''۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے آسمانی مذاہب کے ماننے والوں کو اتحاد کی دعوت دی۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

قُلْ یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ ...الخ (3:64) ''کہہ دو کہ اے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو ہم میں تم میں برابر ہے۔''

ان کلمات طیبات سے واضح ہوا کہ قرآن کریم آسمانی مذاہب کے ماننے والوں کو اتحاد کی دعوت دیتا ہے اور اتحاد کی دعوت دینا قرآن کریم کی خصوصیات میں سے ایک ہے۔

قرآن کریم کی ایک خاصیت یہ ہے کہ عربی زبان میں نازل ہوا اور عربی زبان کی فصاحت وبلاغت کی کیا بات ہے! اس زبان کی افادیت واہمیت سے کوئی بھی ماہر لسانیت انحراف نہیں کر سکتا یہ دنیا کی ایک بڑی اور آسان زبان ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوا:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝ (12:2)

''بیشک ہم نے نازل کیا قرآن کو عربی میں تا کہ تم اس کو سمجھ سکو۔''

مولانا صلاح الدین یوسف نے آیت مذکورہ کے تحت بڑی خوبصورت بات کہی وہ کہتے ہیں:

''عربی زبان اپنی فصاحت و بلاغت اور اعجاز اور ادائے معانی کے لحاظ سے دنیا کی بہترین زبان ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس اشرف الکتب (قرآن مجید) کو اشرف اللغات (عربی) میں اشرف الرسل (حضرت محمد ﷺ) پر اشرف الملائکہ (جبرائیل) کے ذریعے نازل فرمایا اور مکہ جہاں اس کا آغاز ہوا دنیا کا اشرف ترین مقام ہے اور جس مہینے میں اس کے نزول کی ابتداء ہوئی وہ بھی اشرف ترین مہینہ رمضان ہے۔''

قرآن کریم رمضان کریم میں نازل ہوا اس حوالے سے قرآن کریم کی یہ آیت ملاحظہ ہو:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ...الخ (2:185)

''مہینہ رمضان کا وہ کہ اتارا گیا جس میں قرآن۔''

قرآن کریم رمضان شریف کی جس مقدس رات کو نازل ہوا اللہ تعالیٰ نے اس رات کا ذکر قرآن کریم میں لیلۃ القدر اور لیلۃ مبرکہ سے کیا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ (97:1) ترجمہ ''بیشک نازل فرمایا ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں'' اور فرمایا:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (44:3)

''بیشک نازل فرمایا اسے مبارک رات میں۔''

ان آیات سے ثابت ہوا کہ قرآن کریم رمضان کے مبارک مہینے کی مبارک رات کو نازل ہوا۔ ان آیات میں ان لوگوں کا رد ہے جو کسی نہ کسی حیلے سے اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن کریم 15 شعبان کو نازل ہوا۔ قرآن کریم کی جس آیت میں قرآن کریم کے ماہ رمضان الکریم میں نازل ہونے کا ذکر ہے اسی آیت میں قرآن کریم کو ھدی للناس بھی قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ...الخ (2:185)

''مہینہ رمضان کا وہ کہ اتارا گیا جس میں قرآن ہدایت انسانوں کے لیے روشن باتیں ہدایت اور فیصلہ کی۔''

آیت مذکورہ میں قرآن کریم کی مزید دو خصوصیات ذکر کی گئی ہیں اول ھدی اللناس دوم الفرقان۔

یقیناً قرآن کریم کتاب ہدایت ہے پندرہ سو سال سے لوگ اس کتاب سے ہدایت پاتے رہے ہیں اور تا قیامت ہدایت پاتے رہیں گے۔ قرآن کریم کتاب ہدایت اس طرح ہے کہ قرآن کریم کا قاری قرآن کریم میں غور و غوض کرتا ہے اور

اس کی روشن آیتوں میں تدبر کرتا ہے اور راہِ ہدایت پاتا ہے ''ہدایت حاصل کرنا'' بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نعمتوں اور رحمتوں میں سے ایک ہے۔ قرآن کریم میں غور وفکر کرنا تو بڑی بات، صرف توجہ سے قرآن کریم کا سننا بھی باعث ہدایت ہے جس کی مثال سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے واقعہ سے دی جاسکتی ہے۔ اسلامی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے ماضی قریب وبعید میں ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ بعض مغربی مستشرقین نے قرآن کریم میں نقائص تلاش کرنے اور تنقید کرنے کی غرض سے قرآن کریم کا مطالعہ کیا۔ مگر ان میں سے چند کو قرآن کریم میں نقائص تو نظر نہیں آئے البتہ انہیں قرآن کریم میں متعدد خوبیاں نظر آئیں اور انہوں نے اس کی صداقت کو قبول کیا اور اس پر ایمان لے آئے۔ قرآن کریم کی صداقت پر مبنی چند عقلی دلائل سے ثابت ہوا کہ قرآن کریم کتاب ہدایت ہے۔ لیکن بدقسمتی سے بعض نام نہاد حادثاتی طور پر وجود میں آنے والے مبلغین اسلام جو صحیح طور پر اسلامی تعلیمات سے نابلد ہوتے ہیں، ان سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ''قرآن پڑھنے سے لوگ گمراہ بھی ہوتے ہیں'' (معاذ اللہ) اس کے ساتھ وہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن بغیر استاد کے نہیں پڑھنا چاہیے، ہر کسی کا ترجمہ وتفسیر نہیں پڑھنی چاہیے''۔ یہ سب باتیں ان کی فضول اور قرآن کریم سے دور کرنے کی باعث ہیں۔ راقم یہ کہتا ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم سنا اور ہدایت پائی اور بھی لوگوں نے قرآن کریم پڑھا، سنا، سمجھا، اس میں غور وفکر کیا، ہدایت پا گئے، قرآن کریم رہنما ہے، راہ دکھاتا ہے۔

اعتراض کرنے والے اپنے قول کو صحیح قرار دینے کے لیے دلیل کے طور پر قرآن کریم کی ایک آیت کا جز پیش کرتے ہیں آیت کا وہ حصہ آپ بھی ملاحظہ کیجئے:

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ (2:26)

''اس سے بہت سے لوگ گمراہ بھی ہوتے ہیں اور بہت سے ہدایت بھی پاتے ہیں۔''

افسوس اس آیت سے استدلال کرنے والے پوری آیت سیاق وسباق کے ساتھ پڑھنے کی زحمت گوارہ نہیں کر سکے، اس لیے وہ قرآن کریم نہ پڑھنے کے سبب خود بھی گمراہ ہوئے اور وہ معاشرے میں گمراہی کی باتیں پھیلا رہے ہیں۔ اگر کوئی ذی شعور شخص اس آیت کا ایک مرتبہ بغور مطالعہ کرے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جو تماثیل پیش کیں ہیں بعض لوگ جو مسلمانوں سے بغض رکھتے ہیں وہ ان مثالوں کا تمسخر کر کے گمراہی مول لیتے ہیں اور بعض ان مثالوں کو سنجیدگی سے پڑھتے ہیں ان میں تدبر کر کے اپنی اصلاح کرتے ہیں وہ راہِ ہدایت پاتے ہیں یعنی لوگ قرآن کریم پڑھ کر اس کی آیات بینات کو سمجھ کر ہدایت پاتے ہیں اور منکرین قرآن، قرآن کریم کے متعلق نازیبا باتیں کرتے ہیں اور امثال القرآن کا مذاق

اڑاتے ہیں گویا قرآن کریم پڑھنے سے نہیں بلکہ قرآن کریم کی بے ادبی کرنے سے گمراہی ملتی ہے۔قرآن کریم کا پڑھنا اور سمجھنا بڑی سعادت کی بات ہے صرف اس کو توجہ سے سننے سے ہی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے یعنی ہدایت ملتی ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۝ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝ (7:203:204)

''ان سے کہو میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب نے میری طرف بھیجی ہے۔یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو، اسے (قرآن کو) قبول کریں، جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر بھی رحمت کا نزول ہو۔''

یعنی قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی وحی اور بصیرت کی روشنی ہے اور قرآن کریم پر ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔تو جب اس قرآن کی تلاوت ہوتی ہے، جو لوگ غور سے اس کی آیتوں کو سنتے ہیں خاموش رہتے ہیں تو ان پر رحمت کا نزول بھی ہوتا ہے اور ہدایت بھی ملتی ہے اور جو لوگ قرآن کریم نہ تو خود سنتے ہیں اور نہ دوسروں کو سننے دیتے ہیں، ظاہر ہے ان بدنصیبوں کو نہ تو رحمت ملتی ہے اور نہ ہی ہدایت اگر ہم اپنا محاسبہ کریں تو ہم با آسانی سمجھ سکتے ہیں کے عصر حاضر میں رحمتوں اور برکتوں کا فقدان پایا جارہا ہے اس کا اصل سبب اہل ایمان کی قرآنی تعلیمات سے دوری ہے۔

سورۃ البقرہ کی آیت 185 میں قرآن کریم کو ''الفرقان کہا گیا ہے(هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ) فرقان مصدر بھی ہے یعنی الگ الگ کرنا، حق کو باطل سے جدا کرنا اور صیغۂ صفت بھی یعنی حق کو باطل سے الگ کر دینے والی شے ،قرآن کریم ،تورات، دلیل و حجت، وہ نور جس سے حق و باطل میں امتیاز ہو جائے'' یعنی اللہ تعالیٰ کی الہامی کتاب جو حق و باطل کو الگ الگ کر دے، الفرقان، قرآن کریم کا ایک صفاتی نام ہے اور قرآن کریم کی پچیسویں (25) سورۃ کا نام بھی الفرقان ہے اس سورۃ کی پہلی آیت میں قرآن کریم کا یہ صفاتی نام دوسری مرتبہ بطور قرآن کریم کی صفت کے آیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰي عَبْدِهٖ ---الخ (25:1)

''کتنا برکت والا ہے جس نے اتارا فیصلہ حق و باطل (قرآن) کو اپنے بندہ پر۔''

قرآن کریم کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ کتاب مبین ہے۔کتاب مبین کا لفظ قرآن کریم میں مختلف مقامات پر آیا ہے۔کتب مبین کے معنیٰ ''روشن کتاب اور واضح کتاب کے ہیں۔کتاب مبین قرآن کریم کا ایک صفاتی نام ہے۔سورۃ المائدہ میں ارشاد ہوا:

قَدْ جَاۗءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ (5:15)

''بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا اور روشن کتاب''

کتاب مبین کی اصطلاح سورۃ نمل میں بھی استعمال ہوئی ہے آیت ملاحظہ ہو:

طٰسٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۙ (27:1)

''یہ طس ہے۔ یہ قرآن اور واضح کتاب کی آیات''

یعنی یہ آیتیں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اور واضح کتاب کی باتیں ہیں۔

قرآن کریم کے ایک اور مقام پر کتب مبین کی اصطلاح اس طرح استعمال ہوئی ہے۔ قرآنی آیت ملاحظہ ہو:

وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

(10:61)

''اور تمہارے رب سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز مخفی نہیں نہ زمین میں نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی مگر وہ ایک واضح کتاب میں درج ہے۔''

اگرچہ علماء مفسرین نے اس مقام پر کتاب مبین سے مراد لوح محفوظ لیا ہے حقیقت میں تو قرآن کریم اس عنوان کے تحت دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۙ (34:3)

''اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں نہ ذرے بڑی اور نہ اس سے چھوٹی سب کچھ واضح کتاب میں موجود ہے۔''

ان آیات سے ثابت ہوا کہ تمام ظاہر و پوشیدہ علم کتاب مبین میں موجود ہیں اور کتاب مبین قرآن کریم کا ایک صفاتی نام ہے۔ قرآن کریم تمام علوم کا خزانہ ہے اس کی شہادت قرآن کریم کی کچھ اور آیتوں سے بھی ہوتی ہے۔ اس خصوصیت کے حوالے سے سورۃ الاعراف کی یہ آیت بھی ملاحظہ ہو:

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (7:52)

''اور بیشک ہم ان کے پاس ایک کتاب لائے (قرآن کریم) جسے ہم نے ایک بڑے علم سے مفصل کیا ہدایت و رحمت ایمان والوں کے لیے۔''

اس حوالے سے سورۃ یونس کی آیت بھی ملاحظہ ہو:

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (10:37)

''اور اس قرآن کریم کی یہ شان نہیں کہ کوئی اپنی طرف سے بنالے اللہ کے سوا ہاں وہ اگلی کتابوں کی تصدیق ہے اور تفصیل الکتٰب کی۔ اس میں کچھ شک نہیں پروردگار عالم کی طرف سے ہے۔''

اور فرمایا:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (85:21-22)

''بلکہ وہ کمال شرف والا قرآن ہے لوح میں محفوظ۔''

معلوم ہوا ہر چیز کا ذکر قرآن کریم میں ہے اور قرآن کریم لوح میں محفوظ ہے۔ اس سلسلے کی یہ آیت بھی ملاحظہ ہو:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (16:89)

'' اور ہم نے یہ کتاب آپ پر نازل کی جو ہر چیز کی صاف صاف وضاحت کرنے والی ہے اور ہدایت ورحمت اور بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔''

ان آیات سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ قرآن کریم میں ہر چیز کا ذکر ہے اور قرآن کریم ہی کتاب مبین ہے۔ قرآن کریم میں قرآن کریم کے لیے کتاب مبین کے علاوہ ام الکتاب کی اصطلاح بھی استعمال ہوئی ہے سورۃ زخرف میں یہ دونوں اصطلاحات ایک کے بعد دوسری استعمال ہوئی ہیں۔ قرآنی آیات ملاحظہ ہو۔

حٰمٓ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ (43:1-4)

''ح۔م۔ قسم ہے اس واضح (روشن) کتاب کی کہ ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم لوگ اسے سمجھو اور درحقیقت یہ ام الکتاب میں لکھی ہوئی ہے ہمارے ہاں بڑی بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز''

اس مقام پر کتاب مبین سے مراد قرآن کریم ہے ام الکتب بھی قرآن کریم کا ایک صفاتی نام ہے۔

سورۃ آل عمران میں بھی ام الکتب کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے آیت ملاحظہ ہو:

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (3:7)

''وہی اللہ ہے جس نے یہ کتاب آپ پر نازل فرمائی اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں ایک محکمات جو کتاب کی

اصل بنیاد ہیں اور دوسری متشابہات''۔

اس آیت میں قرآن کریم کی آیات محکمات کو ام الکتب قرار دیا گیا ہے ام الکتب سے مراد ''کتاب کی اصل'' ہے۔ آیت مذکورہ سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ قرآن کریم ام الکتاب ہے، یہ بات بھی ممکن ہے کہ قرآن کریم کا صفاتی نام ''ام الکتب'' اس آیت کے تحت معروف ہوا ہو۔

قرآن کریم میں جس طرح ہر چیز کا بیان ہے اسی طرح اس کتاب میں ہر شے کی مثال بھی بیان کی گئی ہے۔ ہر شے کی مثال کا قرآن کریم میں ہونا قرآن کریم کی خصوصیات میں سے ایک ہے، اس خصوصیت کی نشاندہی کرنے والی آیات ملاحظہ ہوں، سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۔۔۔الخ (17:89)

''اور بیشک ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثل طرح طرح سے بیان فرمائی ہے۔''

سورۃ روم کی آیت 58 اور سورۃ زمر کی آیت 27 میں بھی اسی بات کی تکرار ہوئی ہے البتہ ان دونوں آیتوں میں ''وَلَقَدْ صَرَّفْنَا'' کے بجائے ''وَلَقَدْ ضَرَبْنَا'' کے الفاظ آئے ہیں اس مقام پر سورۃ زمر کی آیت ملاحظہ ہو:

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (39:27)

''اور بیشک ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی کہاوت بیان فرمائی۔''

تاکہ انسان ان طرح طرح کی مثالوں کو پڑھ کر غور وفکر کریں اور ہدایت کی بات کو سمجھیں۔ ہدایت کے پیغام کو قبول کر کے ہدایت کی راہ پر گامزن ہو جائیں۔

قرآن کریم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں لوگوں کے لیے شفا رکھی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۔۔۔الخ (17:82)

''ہم قرآن کے سلسلہ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لیے شفا و رحمت ہے''

یعنی جو لوگ قرآن کریم کو قبول کرتے ہیں اس کو اللہ تعالیٰ کی کتاب مان کر اس کی تلاوت کرتے ہیں اس میں غور وغوض کرتے ہیں اس کو حاکم بناتے ہیں تو قرآن کریم انہیں کفر وشرک کے علاوہ دیگر ظاہری و باطنی بیماریوں سے بھی شفا پہنچاتا ہے۔

قرآن کریم کو رب العالمین نے کتاب العالم بنا کر نازل فرمایا ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (81:27)

''یہ تو سارے جہاں والوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔''

قرآن کریم ایک عالمگیر کتاب ہے یہ صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کی اصلاح کے لیے نازل ہوئی اور تمام انسانوں کو اسی کتاب کی اطاعت کرنی چاہیے کیوں کہ قرآن کریم باعث اطاعت ہے اور قرآن کریم کے نزول کا مقصد بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندے اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن کریم کی اتباع کریں۔ اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے۔ آیت قرآنی ملاحظہ ہو:

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝ (6:155)

''اور یہ کتاب برکت والی ہم نے اتاری تو اس کی پیروی کرو اور تقویٰ اختیار کرو تا کہ تم پر رحم ہو۔''

دوسرے مقام پر ارشاد ہوا:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۝ (7:3)

''تم لوگ چلو اس پر جو تمہاری طرف اتارا گیا تمہارے رب کی طرف سے اور مت پیروی کرو جو قرآن کو چھوڑ کر حاکم ہیں۔ تم لوگ کم ہی نصیحت قبول کرتے ہو۔''

ان آیات سے واضح ہوا کہ ہمیں جس کتاب کی پیروی کرنی چاہئے وہ صرف اور صرف قرآن کریم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسری کتابوں کو حاکم بنانے سے منع فرمایا ہے جو غیر آسمانی اور انسانوں کی مرتب کردہ ہیں۔ اس وقت دنیا میں آسمانی کتابوں میں صرف قرآن کریم ہی ہے جو اپنی اصل حالت میں موجود ہے قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ قرآن کریم جناب رسول اللہ ﷺ کے قلب پر نازل ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس کتاب پر ایمان لانے اور اس کتاب کی پیروی کرنے کا حکم دیا اب قیامت تک جس کتاب کی پیروی کی جائے گی، وہ قرآن کریم ہے۔ جس کتاب کو حاکم مانا جائے گا، وہ قرآن کریم ہے۔ جس کتاب کے مطابق فیصلہ دیا جائے، وہ کتاب قرآن کریم ہے۔ اس حوالے سے بھی قرآن کریم کی متعدد آیات ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن کریم کی چند آیات ملاحظہ فرمائیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۝ (5:44)

''اور جو فیصلہ نہ کریں اس کے مطابق جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے تو وہی لوگ کافر ہیں''۔

اور فرمایا:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝ (5:45)

''اور جو فیصلہ نہ کریں اس کے مطابق جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے تو وہی لوگ ظالم ہیں''۔

اور فرمایا:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ط (5:48)

''آپ فیصلہ فرمائیں ان کے درمیان اس سے جو نازل فرمایا اللہ تعالیٰ نے اور آپ نہ پیروی کریں ان کی خواہشات کی اس حق کو چھوڑ کر جو آپ کے پاس آیا ہے''

ان آیات میں واضح طور پر قرآن کریم کی اتباع کرنے اور اس کی روشنی میں فیصلہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اس سورۃ کی اگلی آیات میں ارشاد ہوا:

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ط فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ط وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ۝ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ط وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ (5:49-50)

''اور یہ کہ فیصلہ فرمائیں آپ ان کے درمیان اس کے مطابق جو نازل فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے اور نہ پیروی کریں ان کی خواہشات کی اور آپ ہوشیار رہیں ان سے کہ کہیں برگشتہ نہ کر دیں آپ کو اس کے کچھ حصہ سے جو اتارا ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف اور اگر وہ منہ پھیر لیں تو جان لو کہ بیشک ارادہ کر لیا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ سزا دے انہیں ان کے بعض گناہوں کی اور بیشک بہت سے لوگ نافرمان ہیں تو کیا وہ جاہلیت کے زمانہ کے فیصلے چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بہتر کس کا حکم ہو سکتا ہے اس قوم کے نزدیک جو یقین رکھتی ہے''

ان آیات میں واضح طور پر قرآن کریم کی اتباع کرنے اور قرآن کریم کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا ہے ان آیات میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول مکرم ﷺ کو مخاطب فرما کر صرف اور صرف قرآن کریم کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم ارشاد فرما رہا ہے قرآن کریم کے خلاف کرنا عہد جاہلیت کا طریقہ ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ کی آمد سے قبل مکہ میں کوئی منزل من اللہ دستور نہ تھا اور اہل کتاب نے بھی وحی کی تعلیمات کو فراموش کر دیا تھا ان آیات میں یہی تاکید کی گئی ہے کہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا یعنی جو قرآن کا خلاف کرے گا وہ انہی لوگوں میں شمار ہوگا۔ قرآن کریم متعدد خوبیوں سے مالا مال ہے ہم نے چند ہی خوبیاں ذکر کیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن کریم کی اتباع کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

خواجہ ازہر عباس، فاضل درس نظامی
www.azharabbas.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد اقامت دین ہوتا تھا

انسانوں نے جب آپس میں مل جل کر رہنا شروع کیا تو اس وقت کوئی (Organized) معاشرہ نہیں ہوتا تھا۔ جو لوگ زیادہ ذہین اور طاقتور ہوتے تھے وہ معاشروں کے سربراہ ہو جاتے تھے۔ خواہش انسانوں کی ہمیشہ یہ ہوتی تھی کہ ہم حاکم بنے رہیں اور دوسرے لوگ ہمارے محکوم رہیں۔ اس اقتدار پسندی کی ہوس کی داستان بیان کرنا ہی انسانی تاریخ ہے۔ اقتدار حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کے حیلے بہانے کئے جاتے تھے۔ ہمارے ہاں بنو عباس کے دور میں ہر خلیفہ کے مرنے کے بعد اس کی جانشینی پر خون ریزیاں ہوتی تھیں۔ عموماً جانے والا خلیفہ اپنے آنے والے ولی عہد مقرر کر دیتا تھا۔ حجر اسود کے سامنے قسمیں کھائی جاتی تھیں، جانشینی کے متعلق تحریری وثیقے حجر اسود کے ساتھ رکھے جاتے تھے لیکن اقتدار کی ہوس کے آگے یہ سب بے سود ہوتے تھے۔ انسان کا اقتدار پسندی کا یہ جذبہ کم نہیں ہوا۔ البتہ اس کو ذرا سا Sophisticated کر دیا گیا ہے۔ نظام جمہوریت میں ہر پارٹی اقتدار حاصل کرنے کے نام پر بنائی جاتی ہے۔ اقتدار پسندی کو عوام کی محبت کا نام دیا جاتا ہے اب چونکہ حاکم بننے کے دعویٰ کو قدرے ناپسند کیا جانے لگا ہے اب اس کا نام قوم کی خدمت کرنا رکھ دیا گیا ہے اور جو یہ خدمت کرتا ہے وہ خادم اعلیٰ کہلائے جانے لگا ہے۔ ہر حاکم یہ چاہتا ہے کہ ہم ساری عمر حاکم رہیں اور ہمارے بعد ہماری نسلیں حاکم رہیں۔ اس قسم کے قوانین بنائے جاتے ہیں جو اپنی نسلوں کو ہمیشہ اقتدار میں رکھنے میں مدد و معاون ہوں۔ مسلمان ممالک میں یہ جذبہ زیادہ رہا ہے۔ ہمارے مسلم ممالک میں اقتدار پسندی کے علاوہ ہمارے حاکموں میں لوٹ مار کرنے کا جذبہ بھی بہت ہے۔ تقریباً تمام مسلم ممالک کے حکمران لٹیرے، دغاباز، اور بدسیرت واقع ہوتے ہیں۔ اربوں روپوں کا غبن کرنے کے باوجود مزید دولت کمانے کے خواہش مند ہیں۔

امریکہ میں نئے صدر نے اقتدار سنبھالا ہے۔ ان کی پہلی تقریر بڑے غور سے سنی گئی ہے۔ اس ساری تقریر میں صرف امریکہ کے مفاد کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ انسانیت کے مفاد کی ایک بات بھی اس تقریر میں نہیں ہے۔ انسان کے اقتدار پسند ہونے، اپنے مفاد میں، اور دوسروں کے خلاف قانون بنانے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو قانون سازی کا حق ہی نہیں دیا۔ بلکہ شروع دن سے انبیاء اکرم علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ شروع کر کے ان کی معرفت احکام و قوانین عطا کرنے شروع کر دیئے تھے ہر نبیؑ اپنے ساتھ ایک ضابطۂ حیات لاتا تھا اور اس ضابطۂ حیات کو اس دنیا میں قائم کرتا تھا۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى

وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ط (42:13)

ترجمہ: اس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا جس کا حکم اس نے نوح ؑ کو دیا تھا اور جسے (اے محمد ﷺ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ اس دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

''اَقِيْمُوا الدِّيْنَ'' کا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب نے ''قائم کنید دین را'' کیا ہے اور ان کے صاحبزادگان شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے اس کا ترجمہ ''قائم رکھو دین کو'' یہ دونوں ترجمے بالکل درست ہیں۔ ان کا پہلا فرض یہ تھا کہ جہاں دین قائم نہیں ہے وہاں اسے قائم کریں اور جہاں قائم تھا وہاں اسے قائم رکھیں۔

یہ حقیقت کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد دین کا قائم کرنا تھا۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے پہلے قرآنِ کریم کی چند اصطلاحات کو پوری طرح سمجھنا ضروری ہے کیونکہ ان اصطلاحات کو سمجھنے کے بعد بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

ہمارے ہاں تصنیف و تالیف اور تفاسیر تحریر کرنے کی ابتداء جب بنو عباس کے دور میں ہوئی اس وقت دین بالکل مذہب میں تبدیل ہو چکا تھا اور قرآنِ کریم کی اصطلاحات کے قرآنی معانی بالکل غیر قرآنی بن چکے تھے۔ قرآنِ کریم عربوں کی روزمرہ کی زبان میں نازل ہوا۔ قرآنِ کریم نے ان ہی روزمرہ کے الفاظ میں الف لام کا اضافہ کر کے ان کو اپنی اصطلاحات بنا لیا جس کے خاص معنی مقرر کر دیئے۔ ان اصطلاحات کا مفہوم تصریفِ آیات سے واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن جب ہمارے ہاں تفاسیر تحریر کرنا شروع ہوئیں تو ایرانی اثرات کی وجہ سے ان اصطلاحات کے معنی بدل دیئے گئے اور ان کے غیر قرآنی مفہوم اختیار کر لئے گئے تھے ان میں ایک قرآنی اصطلاح عبادت کا لفظ ہے ہمارے ہاں عبادت کے معنی پرستش کرنا اور پوجنا کر دیئے گئے ہیں جبکہ قرآن نے اس لفظ کو محکومیت کے لئے استعمال کیا ہے۔ اب ہم اپنے سامنے یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ عبادت کے معنی محکومیت اختیار کرنا ہے، اس کے معنی پرستش کرنا یا پوجنا نہیں ہے۔ سورۃ البقرہ میں قصاص کا حکم نازل ہوا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ط اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ (2:178)

اے ایمان والو تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض ٹھہرایا گیا ہے، آزاد کے بدلے آزاد، اور غلام کے بدلے غلام۔

اس آیۂ کریمہ میں قرآنِ کریم نے ''اَلْحُرُّ'' کے مقابلہ میں ''الْعَبْدُ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ''حر'' کے مقابلہ میں ''عبد'' ہوتا ہے۔ غلام اپنے آقا کی محکومیت اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنے آقا کی پرستش نہیں کرتا۔ اس لئے عبادت کے معنی محکومیت اختیار کرنا ہے، پرستش کرنا نہیں ہوتے۔

2۔ قرآنِ کریم نے ''خدا کی عبادت'' کے مفہوم کو اسی معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں ہم اس کو حکومت کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں ارشادِ عالی ہے: وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾ (18:110) ترجمہ: تمہیں چاہئے کہ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کریں۔''

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ (18:26) وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اس لئے عبادت کا لفظ محکومیت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

3۔ سورۂ یوسف میں ارشاد ہوا ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (12:40) ترجمہ: حکومت اللہ کے علاوہ کسی کی نہیں ہوسکتی۔ اور اس کے بعد فرمایا: اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ (12:40) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی حکومت اختیار نہ کرو۔ ان مقامات پر قرآنِ کریم نے عبادت اور محکومیت کو ایک معنی میں بیان کیا ہے۔

4۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے جب فرعون اور اس کے سرداروں کے سامنے اپنی دعوت پیش کی تو انہوں نے کہا: فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ (23:47) ترجمہ: تو کہا ہم ایمان لائیں اپنے جیسے دو آدمیوں پر ان اور ان کی قوم ہماری تابعدار ہے۔ بنی اسرائیل فرعون اور اس کی قوم کی عبد تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ ان کی محکوم تھی وہ ان کی پرستش نہیں کرتی تھی۔ اس لئے عابد کا ترجمہ محکوم ہے، اس کا ترجمہ پرستندہ نہیں ہوسکتا۔

5۔ جب حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اس کی قوم کو دعوتِ اسلام دی تو فرعون نے اپنے وہ احسانات جتانے شروع کر دیئے جو اس نے بنی اسرائیل پر کئے تھے اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے فرمایا تھا ہاں تمہارے احسانات یہ ہیں کہ: اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾ (26:22) ترجمہ: ''تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنایا۔'' کیا تمہارے یہی احسانات ہیں کہ تم نے میری قوم بنی اسرائیل کو اپنی غلامی اور محکومی کے شکنجے میں کس لیا ہے۔ اس جگہ عبدت کا معنی تم نے غلام بنایا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ عبادت کے معنی محکومیت ہیں، پرستش نہیں ہیں ہمارے خیال میں یہ پانچ آیات کافی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عبادت کے معنی محکومیت کے ہیں پرستش کے ہرگز نہیں ہوسکتے۔

قرآنِ کریم کی دوسری اہم اصطلاح ''اِلٰہ'' ہے ہمارے ہاں عموماً اس کا ترجمہ معبود کر دیا جاتا ہے یعنی پرستندہ جس کی پرستش کی جائے۔ یہ ترجمہ غلط ہے قرآنِ کریم نے ''اِلٰہ'' کو حاکم کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

1۔ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾ (26:29) ترجمہ: (فرعون نے) کہا اور اگر تو نے میرے علاوہ کسی اور کو حاکم ٹھہرایا تو تجھ کو قید میں ڈال دوں گا، اس مقام پر خود حضرت شیخ الہند نے ''اِلٰہ'' کا ترجمہ حاکم کیا ہے۔

2۔ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ (43:84) ترجمہ: وہی ہے جو آسمان میں بھی حاکم ہے اور زمین میں بھی حاکم ہے۔

3۔ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۷۰﴾ (28:70) ترجمہ: وہی اللہ ہے اس کے علاوہ کوئی حاکم نہیں۔ اسی کی تعریف ہے دنیا و آخرت میں، اسی کے ہاں ہے حکومت اور اسی کی طرف پھیرے جاؤ گے۔ اس آیۂ کریمہ میں قرآنِ کریم نے خود ''لَهُ الْحُكْمُ'' کہہ کر ''اِلٰہ'' کو Define کر دیا کہ جس کے پاس حق حکومت ہوتا ہے وہ ''اِلٰہ'' ہوتا ہے۔

4۔ ارشادِ عالی ہے: وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ

تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۸﴾ (28:88) ترجمہ: اور اللہ کے علاوہ اور دوسرا حاکم نہ پکار ہر چیز فنا ہے سوائے اس کے۔ اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف پھیرے جاؤ گے۔ اس آیت میں ''اِلٰہ'' کے معنی حاکم کے ہیں۔ حاکم کے علاوہ دوسرے معنی نہیں ہو سکتے۔

5۔ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ (23:117) ترجمہ: اور جو اللہ کے ساتھ دوسرا حاکم پکارے اس کی کوئی سند نہیں۔ ترجمہ حضرت شیخ الہند آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ''اِلٰہ'' کے قرآنی معنی حاکم ہیں۔ حضرت شیخ الہند نے بھی ''اِلٰہ'' کے معنی حاکم کے ہی کئے ہیں۔ ہم نے صرف چند آیات اپنی تائید میں تحریر کی ہیں ورنہ تو سارا قرآن ہی اس تائید میں کھڑا ہے۔ مسجد کی محراب سے جو ہم پانچ وقت اذان دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ حاکم صرف اللہ ہے اس کے علاوہ کوئی حاکم نہیں۔ اس آیت میں قرآن نے فرمایا: لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ (23:117) اللہ کے علاوہ کسی کو بھی حاکم بنانے کی کوئی دلیل ہی نہیں ہے۔ قرآن نے اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کا دروازہ ہی بند کر دیا۔

قرآنِ کریم کی تیسری غور طلب اصطلاح دین ہے سورۂ یوسف میں دِيْنِ الْمَلِكِ (12:76) کے معنی بادشاہ کا قانون ہے۔ سورۂ نور میں جہاں زنا کی سزا کا ذکر ہوا ہے وہاں دِيْنِ اللّٰهِ (24:2) کے معنی خدا کا قانون یا خدا کا ضابطہ حکومت آیا ہے۔ سورہ الحدید میں وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ (9:29) کے معنی وہ نظامِ خداوندی کی اطاعت اختیار نہیں کرتے آیا ہے۔

قرآنِ کریم کی چوتھی مشہور اصطلاح **الطاغوت** ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جس کی بھی اطاعت اختیار کی جائے وہ الطاغوت ہے۔ یعنی ہر غیر خدائی قانون یا نظام، ہر وہ قوت جو خدا کے قانون سے سرکشی اختیار کر جائے طاغوت ہے۔ معاشرے جو دو طرح کے ہی ہو سکتے ہیں۔ یا اس میں وحی الٰہی کا قانون نافذ ہوگا یا اس میں انسانوں کا وضع کردہ قانون جاری ہوگا۔ جس معاشرہ میں وحی خداوندی کا قانون جاری ہے۔ اس معاشرہ کو خود خدا نے الدین کہہ کر پکارا ہے اور جس معاشرہ میں انسانوں کے وضع کردہ قوانین جاری ہوں وہ الطاغوت ہیں۔ یہ دونوں نظام ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔

ان چاروں اصطلاحات کو واضح کر دینے کے بعد اب بات بہت آسان ہو جاتی ہے۔ اب صرف آیات کے حوالے دینے باقی رہ جاتے ہیں کہ انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصد اقامتِ دین تھا۔ اب ہم آپ کے سامنے مع تراجم کے آیات پیش کرتے ہیں جن میں ہر نبیؑ نے اقامتِ دین کی دعوت دی ہے۔

1۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (7:59) ترجمہ: بے شک ہے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا پس اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے علاوہ تمہارا کوئی حاکم نہیں۔

2۔ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ (7:65) ترجمہ: اور ان کے بھائی ھود کو قوم عاد کی طرف بھیجا، بولا اے میری قوم اللہ کی محکومیت اختیار کرو، اس کے علاوہ تمہارا کوئی حاکم نہیں۔ سو کیا تم ڈرتے نہیں۔

3۔ وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (7:73) ترجمہ: اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا (جس نے) کہا اے میری قوم اللہ کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے علاوہ تمہارا کوئی حاکم نہیں۔

4۔وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ (7:85) ترجمہ: اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے علاوہ تمہارا کوئی حاکم نہیں۔

5۔وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ (11:61) ترجمہ: اور ان کے بھائی صالح کو ثمود کی طرف بھیجا بولا اے قوم محکومیت اختیار کرو اللہ کی، اس کے علاوہ تمہارا کوئی حاکم نہیں حضرت شیخ الہند نے یہاں حاکم ہی ترجمہ کیا ہے۔

6۔وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ (11:50) ترجمہ: اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا بولا اے قوم محکومیت اختیار کرو اللہ کی، اس کے سوائے تمہارا کوئی حاکم نہیں، تم سب جھوٹ بولتے ہو۔

7۔وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِکْیَالَ وَالْمِیْزَانَ (11:84) ترجمہ: اور ان کے بھائی شعیب کو مدین کی طرف بھیجا اے میری قوم اللہ کی محکومیت اختیار کرو، اس کے علاوہ کوئی حاکم نہیں اور ماپ نہ گھٹاؤ اور نہ گھٹاؤ تول۔

8۔وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾ (23:23) اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کے پاس بھیجا۔ اس نے کہا اے قوم اللہ کی محکومیت اختیار کرو اس کے علاوہ تمہارا اور کوئی حاکم نہیں۔

9۔ارشادِ عالی ہے: وَاِبْرٰھِیْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِہِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاتَّقُوْہُ ؕ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾ (29:16)، اور ابراہیم کو جب اس نے اپنی قوم سے کہا اللہ کی محکومیت اختیار کرو، اس سے ڈرتے رہو۔ یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم سمجھتے ہو۔

10۔ وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا ۙ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَارْجُوا الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۳۶﴾ (29:36) ترجمہ: اور ان کے بھائی شعیب کو مدین کی طرف بھیجا۔ بولا اے قوم محکومیت اختیار کرو اللہ کی اور پچھلے دن کی توقع رکھو، اور زمین میں خرابی مچانے والے نہ بنو۔

ہم نے یہ دس آیات کریمات تحریر کی ہیں۔ ان آیات سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ جب بھی کوئی رسول کسی قوم میں بھی آیا اس نے اس قوم کو پہلا پیغام یہی دیا کہ اے میری قوم اللہ کی محکومیت اختیار کرو اور وہی تمہارا حاکم ہے۔ سارا قرآن کریم اس ہی مضمون کی آیات سے بھرا پڑا ہے جن میں اقامتِ دین کا حکم دیا گیا ہے۔ یہاں تک ہم نے انبیاء کرامؑ کی فرداً فرداً دعوت کا ذکر کیا ہے لیکن سورۃ النحل میں تمام انبیاء کرامؑ کے مجموعہ تعلیم کو Sum up کر کے ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ (16:36) ترجمہ: ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعے سب کو آگاہ کر دیا کہ ''اللہ کی محکومیت اختیار کرو اور طاغوت سے بچو۔''

ہم نے شروع مضمون میں عبادت اور طاغوت دونوں اصطلاحوں کی تصریف آیات کے ذریعے خوب وضاحت کر دی تھی جس کی وجہ سے اب اس آیت کا ترجمہ کرنا اور قرآنی مفہوم سمجھنا بالکل آسان ہو گیا ہے۔ ارشادِ خداوندی یہ ہو رہا ہے کہ ہم نے ہر ہر قریہ اور ہر ہر اُمت میں ایک رسولؑ ضرور بھیجا ہے اور ان سب کی مشترکہ تعلیم یہی تھی کہ محکومیت صرف اللہ کی اختیار کرو اور صرف اللہ کو ہی حاکم تسلیم کرو۔ دوسرے الفاظ میں ان کا واضح حکم یہ تھا، دین قائم کرنے کی کوشش کرو۔ بالکل اسی مفہوم کو قرآن کریم نے سورہ البقرہ میں

بھی ارشاد فرمایا ہے فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ (2:256) ترجمہ: تو جس شخص نے بتوں سے انکار کیا اور خدا ہی پر ایمان لایا تو اس نے وہ مضبوط رسی پکڑ لی جو ٹوٹ ہی نہیں سکتی اور خدا سنتا اور جانتا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ طاغوت سے بالکل انکار کر دو کیونکہ جو قوم غیر اسلامی نظام سے انکار کر دے اور قرآنِ کریم کے نظام پر ایمان لے آئے تو سمجھو کہ اس قوم نے ایک بہت مضبوط سہارا پکڑ لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ یہ ہے اللہ پر ایمان لانا۔ جتنی بھی غیر خداوندی قوتیں دنیا میں ہیں، پہلے ان کی محکومیت سے انکار کرنا، پھر قرآنِ کریم کا نظام اختیار کرنا اس سے انسان اس قدر مضبوط سہارا پکڑ لیتا ہے کہ وہ ٹوٹ نہیں سکتا۔

یہاں تک تو یہ بات ثابت ہوئی کہ انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصد اقامتِ دین تھا، اسی سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے: كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۱﴾ (58:21) ترجمہ: اللہ لکھ چکا ہے کہ میں اور میرے رسولؑ غالب رہیں گے۔ بے شک اللہ قوی و عزیز ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ آیت کے آخر میں وہ صفاتِ خداوندی آتی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی قوت اور اس کے غلبہ کا حال معلوم ہوتا ہے اور یہ اس وعدے کی دلیل دی گئی ہے کہ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کو ہی غلبہ حاصل ہوگا۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کوئی کمزور ہستی نہیں ہے۔ بلکہ وہ قوی بھی ہے اور عزیز بھی ہے۔ وہ جب اپنی مخلوق کے پاس اپنا رسولؑ بھیجتا تھا تو وہ رسولؑ اس کا نمائندہ ہوتا تھا جو لوگوں کے پاس اُس بادشاہ کے احکامات لے کر آتا تھا جو واقعاً میں حقیقی بادشاہ ہے۔ اگر لوگ اس مالکِ حقیقی کے احکامات کی اطاعت اور اقامتِ دین کے لئے آمادہ ہوتے تھے تو وہ مالک حقیقی ان کو غلبہ و اقتدار دیتا تھا۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ انبیاء کرامؑ کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد نبوت ختم ہوگئی اور انبیاء کرامؑ کی بعثت کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ برقرار ہے کہ ہم اور ہمارے رسولؐ غالب رہیں گے۔ نبیؐ کے نہ ہونے کے باوجود اس وعدہ کے برقرار رہنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ وعدہ اس جماعت کی طرف منتقل ہوجاتا ہے جو اقامت دین کے لئے اٹھ کھڑی ہو۔ سورہ توبہ میں بھی اس بات کو دہرایا گیا ہے۔ قرآنِ کریم نے حضور ﷺ کی وفات کے بعد اس کتاب کا وارث اُمت، اور مومنین کو بنایا ہے اسی لئے مومنین پر اقامتِ دین فرض قرار دیا گیا ہے۔ جب یہ جماعتِ مومنین اقامتِ دین کی کوشش کرے گی تو قرآنِ کے اس وعدے کے مطابق اللہ مومنین کی مدد کرے گا اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ (58:22) یہ جماعت ایمان والی ہوئی، اس جگہ روح کا لفظ قرآن کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اس لئے قرآن سے اُنہیں اس طرح مدد ملے گی جس طرح حضرت عیسیٰؑ کو مدد ملی تھی وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ (2:253) ہم نے عیسیٰؑ کو پاک وحی کے ذریعے مدد دی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کو مدد دیتا تھا اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر اس جماعت کی مدد کرے گا جو نیک نیتی سے اقامتِ دین کے لئے اُٹھے گی۔ اگر مذہبی پیشوائیت اقامتِ دین کی راہ میں روک نہ بنے تو مسلمان بحیثیت مجموعی اقامتِ دین کے لئے تیار ہیں۔ ہر ملک میں کئی کئی جماعتیں اقامتِ دین کا کام کر رہی ہیں۔ اقامتِ دین کی کوشش میں سب سے پہلے پرستش کو چھوڑنا ہوگا اور اطاعتِ خداوندی کو اختیار کرنا ہوگا۔ لیکن ہماری پیشوائیت پرستش چھوڑنے کو تیار نہیں ہے۔ کیونکہ پرستش کرنے میں اُنہیں ایک خاص امتیازی مقام ملتا ہے۔ اس لئے نہ وہ پرستش چھوڑیں گے اور نہ اقامتِ دین کے لئے راہ ہموار ہوگی۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بابُ المرسلات

دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ماہنامہ طلوع اسلام کا یہ کالم قارئین کرام کے سوالات اور ان کے جوابات پر مشتمل ہوتا ہے۔ دوقومی نظریہ/نظریۂ پاکستان کے حوالہ سے گذشتہ کئی دہائیوں/عشروں سے اتنی دھول اڑائی جاتی رہی ہے کہ اب نئی نسل کے اذہان میں اس سلسلہ میں ابہام اور کنفیوژن کے سوا کچھ نہیں رہا۔ اس سلسلہ میں الزامات اور جھوٹ ایک ہی طرح کے تواتر سے دہرائے جاتے ہیں۔ ذیل میں ہم محترم ڈاکٹر انعام الحق صاحب کی کتاب ''دوقومی قرآنی نظریہ پر مبنی مطالبۂ پاکستان'' کو سلسلہ وار شائع کر رہے ہیں۔ ان اقساط میں ان تمام سوالوں کے جواب آجائیں گے جو اکثر و بیشتر دوقومی نظریہ کے حوالہ سے کئے جاتے ہیں۔ اُمید ہے قارئین گرامی کو یہ سلسلہ پسند آئے گا۔ (م۔س۔ا)

مقدمہ

مقالہ کی تیاری کے اہداف:

کتاب کا عنوان ''دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان'' انتخاب کرنے کا بنیادی مقصد اختلافات اور تضادات سے پاک بانیانِ پاکستان کے عین موقف کے مطابق آپ کے سامنے لایا جانا ہے۔ لہٰذا آغاز ہی میں آگاہ کرنا لازم ہے کہ بانیانِ پاکستان کا دوٹوک الفاظ میں واضح موقف رہا ہے کہ مطالبہ پاکستان، کی بنیاد دراصل نظریہ قرآن ہی ہے اور اِس بنیاد سے رتی برابر انحراف ہمارے مطالبہ پاکستان کی نفی کا باعث ہوگا۔ اِس ضمن میں اگر نظریہ پاکستان کی فہم میں غلط فہمی کے نتیجہ میں کسی قسم کا ٹھوس اعتراض ذہن میں پیدا ہو، تو اس کا مئوثر اور تسلی بخش جواب قرآن کے توسط سے دینے کی ہر مُمکن کوشش کی گئی ہے۔

اِس کے علاوہ درجِ ذیل اہداف پورا کرنے پر توجہ دینے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے کہ جو

1۔ اختصار سے کام لیتے ہوئے، تعلیم یافتہ اور بالخصوص نوجوان طالب علم طبقوں کے لئے دوقومی قرآنی نظریہ پاکستان سے مکمل آگاہی کا باعث بن سکے۔

2۔ کسی قسم کے اختلافات اور مزید اعتراضات کا باعث نہ بنے۔

3۔ اگر کسی کے دل میں کسی قسم کا اعتراض ہو، تو اُسے اسی تصنیف میں اُس کے اعتراضات کا تسلی بخش جواب بھی مل جائے۔

4۔عصر حاضر کے علمی، تحقیقی اور منطقی تقاضوں پر پورا اترنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اور جدید نظریات سے متاثر ہوئے بغیر، حق اور صرف حق کو سامنے لائے۔

5۔اس میں، عصر حاضر کی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے، ایسے حقائق کو اجاگر کیا جائے، جو پاکستان میں دوقومی قرآنی نظریہ کو عملی طور پر نافذ کروانے میں مدد ومعاون ثابت ہوں۔

میرے اِن اہداف کے پورا ہونے کی تصدیق محترم ذاہد ملک، چیئرمین، نظریہ پاکستان کونسل (ٹرسٹ) اسلام آباد نے کتاب میں پیش لفظ اِس اُمید کے اظہار سے کردی کہ یہ کتاب:

1۔تعلیم یافتہ اور بالخصوص نوجوان طالب علم طبقوں کے لئے، نظریہ پاکستان سے قرآن کے حوالے سے مکمل آگاہی کا باعث بن سکے گی۔

2۔نظریہ پاکستان کے حوالہ سے اُمت میں پیدا ہونے والے ہر قسم کے اختلافات کو دور کرنے کی مؤجب بنے گی۔

3۔اگر کسی کے دل میں دوقومی نظریہ کے بارے میں پہلے سے کسی قسم کا شبہ ہو، تو وہ اِس کتاب سے، ان شبہات کا تسلی بخش جواب حاصل کرسکیں گے۔

4۔عصر حاضر کے علمی، تحقیقی اور منطقی تقاضوں پر پورا اُترتے ہوئے تعلیمی نصاب میں سند کا درجہ حاصل کرلے گی۔

5۔جدید نظریات سے متاثر ہوئے بغیر، قرآن کی روشنی میں لئے گئے جائزہ کو قاری کے سامنے، جدید عصری تقاضوں کے معیار کے مطابق پیش کرے گی۔

اِن خصوصی صِفات کی بنا پر، میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب نظریہ پاکستان سے دلچسپی رکھنے والے افراد، پاکستان اسٹڈی سے تعلق رکھنے والے اساتذہ اور طلبہ کے لئے یکساں طور پر مفید ثابت ہوگی۔

تصنیف پر آمادہ کرنے کے مُحرکات:

مجھے پہلے جو نظریہ پاکستان کی جانب سے اِس کِتاب کی تصنیف کا جو فریضہ سونپا جارہا تھا، میں اپنے آپ کو اُن کو نبھانے پر پُورا اُترنے کا کا اہل نہیں پارہا تھا۔لیکن ساتھ ہی مجھے اِس موضوع پر تھوڑی اہلیت رکھنے کی بِنا پر یہ بھی محسوس ہورہا تھا کہ شاید میں یہ ذمہ داری سنبھال سکوں گا۔ اِس فریضہ کے لئے بنیادی اہلیت کے حصول میں ایک تو میں نے پوسٹ گریجویٹ سے لے کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری اسلامک سٹڈی کے موضوع میں حاصل کی تھی۔

دوسرے میری رسائی تحریکِ پاکستان کے ایک ایسے ادارہ ''طلوع اسلام'' کے ریکارڈ تک بھی تھی جس کا میں چیرمین رہ چُکا تھا اور جو قائداعظم کی ہدایات پر نظریہ پاکستان کا پرچم 1938ء ہی سے طلوع اسلام کے ماہانہ رسالہ کی اشاعت کے وقت سے بلند کئے ہوئے ہے۔ مَیں اب بھی اسی ادارہ کے فکری نمائندہ کی حیثیت سے اس فِکر پر مکمل دسترس رکھنے کے لئے بیشتر وقت اِس کی فِکر کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں، جو پچھلے ستر برس سے بھی زیادہ عرصہ سے نظریہ پاکستان کے اُجاگر کرنے کا داعی رہا ہے۔ اِس دسترس کی بِنا پر ہی مَیں اب نئی تصنیف سامنے لانے کی اہلیت پارہا ہوں جو پہلے سے ضخیم، مُختلف اور نئے انداز میں سامنے لائی جارہی ہے۔

طلوع اسلام ادارہ کے بانی سربراہ محترم علامہ غلام احمد پرویز کے متعلق نظریہ پاکستان سے وابستگی کی سند کی وضاحت اِس سرٹیفکیٹ کی تصدیق سے ہوجاتی ہے، جو تحریکِ پاکستان کے گولڈ میڈل 1989ء ایوارڈ کے وقت مطبوعہ شُعبہ تحریکِ پاکستان محکمہ اطلاعاتِ وثقافت، حکومتِ پنجاب کی طرف سے اِس تصدیق سے جاری کیا گیا کہ:

''1937ء کے موسمِ گرما میں علامہ اقبال کی ایماء پر حضرت قائدِ اعظم نے اپنے شملہ کے قیام کے دوران علامہ پرویز کو بلا کر فرمایا کہ یہ مولوی صاحبان تحریکِ پاکستان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہیں، اِس کی مدافعت کے محاذ کو میں تُمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ حضرت قائدِ اعظم کی ہدایات پر تمام وہ انتظامات مکمل کئے گئے، جن کے نتیجہ میں ماہنامہ ''طلوع اسلام'' کے دورِ جدید کا اجراء، مئی 1938ء کے شمارے کے ساتھ عمل میں آیا۔ اِس ماہنامہ میں پرویز صاحب نے قرآن کے عطا کردہ فرمودہ ''دوقومی نظریہ'' اس مملکت کی ضرورت اور اس کے بنیادی تقاضوں۔ پر گرانقدر مقالے لکھے۔ اس دوران کانگریس اور نیشنلسٹ عُلماء کی طرف سے مسلمانوں کی جُداگانہ مملکت کے خلاف جو کُچھ لکھا جاتا رہا، اس کا آپ نے موثر دفاع کیا۔''

اور مزید یہ بھی درج ہے کہ:

علامہ پرویز 1937۔38 حضرت قائدِ اعظم رحمت اللہ کے تحریکِ پاکستان کی دینی اساس کے موضوع پر ذاتی مشیر کی حثیت سے کام کرتے رہے۔ یہی وہ واحد شخصیت تھی، جنہیں حضرت قائدِ اعظم سے پیشگی وقت لئے بغیر اُن کی خدمت میں، کسی بھی وقت باریابی کا شرف حاصل رہا ہے۔''

اِس حیثیت کے حامل ہونے کی وجہ سے وہ قائداعظم کو علمی، منطقی اور تحقیقی انداز میں علامہ اقبال کے دئے گئے فہمِ قرآن کے اصولوں کی پیروی میں قرآن کی تعلیم کے حصول اور اُس تعلیم کے نتیجہ میں دوقومی نظریہ پاکستان اخذ کرنے میں محمد ومعاون رہے تھے۔ لہذا اُن کی طرف سے نظریہ پاکستان کے ضمن میں لکھی ہوئی تصانیف کو بانیانِ نظریہ پاکستان کی فِکر سے ہم آہنگ ہونے کی بِنا پر مُستند تسلیم کیا جانا تحقیقی اصولوں کے عین مطابق ہے۔

علامہ پرویز کے انہی سطور پر قائداعظم کو دئے گئے درس کی طرز پر فہمِ القرآن کا تفصیلی جائزہ قرآن سے متعلق باب میں لیا گیا ہے۔ میں خود بھی پورے غور وفکر پر ان کے موقف کو درست سمجھتے ہوئے اُن کے دعاوٰی کو اپنے دعاوٰی سمجھتے ہوئے خود کو پوری طرح جوابدہ پاتا ہوں۔ لہٰذا اِس فکری وابستگی کی بنیاد پر مَیں نے اس کتاب کے ہر باب میں اپنی تحقیق کے دوران اِس فکر کی تحقیق سے بھرپور استفادہ حاصل کرنے کی ضرورت کو بہت سی وجوہ کی بِنا پر مستند محسوس کیا ہے۔

قرآن کا عصرِ حاضر سے الگ اُسلوبِ بیان:

آج کے دور میں علم بے شمار شاخوں میں پھیل چکا ہے، اور ہر شاخ کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی ایک معمولی پہلو پر مہارت حاصل کر کے عبور حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ مہارت یا عبور حاصل کرنے کے لئے تحقیقی سکالرز، زندگی کا بیشتر حصہ صرف کر دیتے ہیں تا کہ اُس پہلو پر مکمل دسترس حاصل کر کے، اُسے خود بھی سمجھ سکیں اور دوسروں کو بھی سمجھا سکیں۔

اِس لئے ہر فرد سے یہ توقع کرنا مناسب نہ ہوگا کہ وہ قرآن سے خود ہی زندگی کے ہر پہلو سے مکمل راہ نمائی کے حصول کا

حامل ہوسکتا ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب خصوصی طور پر قرآن پر انحصار کرنے کی بنا پر قرآنی نظریات کے حوالہ سے اہم قرآنی الفاظ اور اس کی اصطلاحات کو سمجھنے کی ضرورت کو بھی پورا کرے گی۔

کتاب کی تصنیف میں مُشکلات کا سامنا:

عمومی طور پر کتاب کے تعارف میں مصنف کو پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ بھی شامل ہوتا ہے۔ کتاب کا عنوان ہی قرآن کے لفظ سے شروع ہوتا ہے لیکن سبھی مُسلمان ممالک میں اسلام پر بات کرنے کی اجارہ داری لے کر مکتبِ مُلا نے اِسے اپنا ذریعہ معاش بنایا ہوا ہے۔ اِس لئے وہ ہر اُس روش کو اپنے معاش کے لئے خطرہ سمجھتے ہیں جو لوگوں کو فہمِ القرآن کے لئے خود غور وفکر کی بِلا واسطہ قرآن کی تلقین کی طرف توجہ دِلائے۔ میری یہ کتاب میرے ڈاکٹریٹ کے مقالہ ہی کا ایک تسلسل ہے، لہٰذا اِسے بھی اپنے موضوع کی وضاحت صِرف قرآن پر اپنی فِکری صلاحیتوں پر انحصار کرنے کے حوالہ سے بات کرنے کا موقف رکھنے سے اُسی قِسم کی مُشکلات کا سامنا کرنا پڑا جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول میں بھی برداشت کرنا پڑی تھیں۔ لہٰذا ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول پر مُشکلات کے سامنا کرنے کو یہاں اِس لئے بھی دُہرایا جارہا ہے تاکہ تحقیق کے طالب علم اپنے آپ پہلے ہی سے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرسکیں۔

میرا یہ موقف بانیانِ پاکستان کے ہمیشہ سے ہی اِس اصول کی پیروی رہا ہے کہ دوقومی نظریہ پاکستان دراصل نظریہ قرآن ہے۔ اُن کے سامنے اِس نظریہ کو صرف قرآن (حَسبُنَا کتابُ اللّٰہِ) کی روشنی میں بیان کرنے کو سند حاصل تھی۔ اِس موقف پر جن رویوں کا سامنا مکتبِ مُلا کی طرف سے کرنا پڑتا ہے، اُن کا اندازہ اس ایک ذاتی واقعہ اور مشاہدہ سے بھی ہوجاتا ہے۔

اِس واقعہ کا آغاز میرے ڈاکٹریٹ پروگرام میں داخلہ کے لیے تحقیقی خاکہ کو تیار کرکے متعلقہ اتھارٹی کے سپرد کرنے سے ہوا۔ اِس میں خاکہ کا عنوان اور اس کی تیاری میں حصولِ مواد جیسے امور پر بحث شامل کی جاتی ہے۔ اِس خاکہ کو زبانی تفصیلی مباحث کے بعد محترم ڈین کی اُصولی منظوری حاصل کرنے کے بعد پیش کیا گیا تھا۔ لہٰذا سبھی ہدایات کی پابندی پر اِسے تسلی بخش قرار دینے کے باوجود بھی اُن کی طرف درجِ ذیل خط پاکر میرے لیے مایوسی کا باعث ہونا فطری آمر تھا۔

''آپ کا خاکہ برائے پی ایچ ڈی''، حکمائے مغرب کے نظریہ خیر وشر کا مطالعہ قرآن کی روشنی میں'' فیکلٹی کی داخلہ کمیٹی میں زیرِ غور آیا۔ یہ محسوس کیا گیا کہ متعلقہ خیر وشر پر قرونِ وسطی میں معتزلہ اور اشاعرہ کے درمیان جو طویل آویزش رہی آپ نے اس سے بالعموم صرفِ نظر کیا ہے اور تفسیری وکلامی ادبیات میں اس موضوع پر جو طویل مباحث ہیں۔ وہ آپ کی نظر میں نہیں ہیں البتہ ان مباحث سے جو نا تمام نتائج غلام احمد پرویز نے اخذ کیے ہیں آپ کا زیادہ تر انحصار ان پر ہے۔ جبکہ یہ امر تحقیق طلب ہے کہ بحیثیت مفسر قرآن جناب غلام احمد پرویز کو اسلامی سکالرشپ میں کیا مقام حاصل ہے؟ اگر اُمت نے ان آرا کو قبول نہیں کیا تو کیا ان کے پیش کردہ نظریہ کو قرآن کے تصورِ خیر وشر کا نام دینا درست ہے۔ آپ اس موضوع پر مسلّم فلاسفہ ومتکلمین کی تالیفات کا مطالعہ کرکے ازسرِ نو خاکہ تیار کریں۔''

یونیورسٹی کے ڈین صاحب ماضی قریب ہی میں میرے ایم فل پروگرام کے نگران رہ چکے تھے۔ اس حوالے سے اُن سے ذاتی شناسائی کی بنا پر ملاقات رہتی تھی۔ انہی ملاقات کے دوران قرآن کے حوالے سے محترم پرویز صاحب کی تحقیق کا اکثر ذکر رہتا تھا۔ قرآن کو قرآن کی رہنمائی میں سمجھنے اور سمجھانے کی روش کو منکرِ سنت کا درجہ دیتے تھے اور پرویز صاحب کی تحقیق کے ذکر پر ناگوار جذبات کے اظہار میں بخل سے کام لینا کفر سمجھتے تھے۔

خط پا کر البتہ حیرانی اس بات پر ہو رہی تھی کہ وہ زبانی گفتگو کی نجی حدود پھلانگ کر اپنی سرکاری حیثیت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے تحریری طور پر اپنے تعصب کو باہر لا رہے تھے۔ اس لیے تاخیر کئے بغیر اُن کو اُسی روز مناسب جواب یوں ارسال کر دیا کہ:

''جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، میں نے تو خاکہ میں ایک طرف صرف حکمائے مغرب اور دوسری جانب سے قرآن کا نظریہ خیر و شر کا تقابلی جائزہ، مختصر الفاظ میں بطور تعارف پیش کیا تھا جس میں حتی الوسع مغربی مفکرین کی آرا کا جائزہ قرآن ہی سے پیش کرنے کا عنوان باندھا تھا۔

یہ کوشش اور مقالہ کا عنوان قرآن ہی کی ہدایت کی روشنی میں انتخاب میں لایا گیا تھا، جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کا جواز بھی پیدا کرنا تھا کہ قرآن اپنا مفہوم خود واضح کرنے کی دسترس رکھتا ہے بشرطیکہ تحقیق کا مدار انسان کی اپنی کاوش سے فکر و تدبر اور عصری علوم میں آگاہی سے حاصل ہو۔ اس کے لیے آپ کے فرمان کے مطابق نہ تو علم کو کسی بھی مکتبِ فکر سے محدود کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی محروم جبکہ اس کی سند میں دلیل بھی صِرف اور صِرف اُمت کا قبول ہونا بطور شرط قرار پایا جائے۔

قرآن کے طالب علم کے لیے اُمت کے لیے قابلِ قبول ہونا کی یہ دلیل سند نہیں ہو سکتی، اِس لئے کہ قرآن نے انسان کی ذاتی کاوشوں سے بِلا جبر اخذ کیے ہوئے علم کو تحقیق کے لیے بطور سند مانا ہے۔ ارشادِ باری ہے کہ:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝ (17:36)

کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمھیں علم نہ ہو۔ یقیناً تمھاری سماعت و بصارت اور دل (Mind) یعنی انسان کے اپنے ہی ذرائع علم، سب ہی کی باز پُرس ہونی ہے۔

قرآن نے اس کے علاوہ بڑے واضح انداز میں اُمت کی آرا کو انسان پر مسلط کرنے سے روکا ہے۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (2:134)

یہ امت تو گزر چکی ہے جو انھوں نے کیا تھا وہ اُن کے لیے ہے اور جو تم کرو گے تمھارے لیے ہے اور اُس کے متعلق تم سے باز پرس نہ کی جائے گی جو وہ کرتے تھے۔

اِس طرح قرآن نے تو واضح طور پر اُمتِ سلف کی آراء کی سند کو نظر انداز کرنے کی طرف راہنمائی فرمائی ہے۔

میرے جواب پر یونیورسٹی کی جانب سے بادلِ نخواستہ داخلہ دینے کی اطلاع تو دی گئی لیکن اپنے ایک سینئر باریش پروفیسر کے ذریعہ تنبیہی پیغام دینا نہ بھولے کہ:

''اگر آپ کامیابی چاہتے ہیں تو محترم پرویز صاحب کے کے موقف سے کنارہ کشی کرنا لازمی ہوگا۔''

جواب میں مَیں نے بڑے ادب سے عرض کی کہ اُن کی تنبیہہ نہ صرف بلا جواز بلکہ علمی روش کے بھی منافی ہے۔ اِس پر پروفیسر صاحب نے بغیر کسی تردد کے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے بڑے فخر سے یہ بھی جتلایا کہ:

اُن کے والدِ محترم نے علامہ پرویز صاحب کو بھری مجلس میں چیلنج دیا تھا کہ وہ بغیر اعراب کے قرآن کی تلاوت کرنے کا اُن سے مقابلہ کریں۔ اگر وہ بغیر اعراب کے پڑھنے میں کامیاب ہوگئے تو وہ یہ تسلیم کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں کہ محترم پرویز صاحب کو عربی زبان پر دسترس حاصل ہے۔ میں نے عرض کی کہ وہ اِس دلیل کے ردِعمل کے طور پر ضرور اِسے نظر انداز کرتے ہوئے اُس مجلس سے کنارہ کشی کر گئے ہوں گے۔

اُنہوں نے مجھ سے وضاحت چاہی کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ بھاگ گئے تھے۔

مَیں نے جواب دیا کہ مَیں جانتا ہوں کہ قرآن ہی کی روشنی میں وہ بے معنی مناظرانہ گفتگو میں نہیں اُلجھا کرتے تھے، وہ اِس کا بھی خیال رکھتے تھے کہ باریش مذہبی بزرگ ہستیوں کا دِل سے احترام کرنے میں کوئی کمی نہیں ہونے دینی چاہیئے لیکن یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ اُن کے سامنے عقلی دلائل پیش کرنے سے مکمل پرہیز کرنا لازمی ہے۔

میں نے اُن کے سامنے محترم پرویز صاحب کی مرتب کی ہوئی کتاب لغات القرآن رکھ دی کہ اس میں کوئی ٹائپ کی غلطی کو صرفِ نظر کرتے ہوئے اِس میں کسی قسم کی مستند سند کا حوالہ کے بغیر اور یا پھر اُس میں سند اور قواعدِ زبان سے انحراف کرتے ہوئے مُختلف مطالب پیش کرنے کی نشاندہی کر دیں، جس سے اُن کی عربی زبان پر مہارت ثابت نہ ہو سکے۔ اگر اِس نشاندہی کا تسلی بخش جواب دستیاب نہ ہوا تو تبھی عربی زبان میں مہارت نہ ہونے پر سوال اُٹھانا جائز ہوگا۔

اُنہوں نے چیلنج تو قبول کر لیا لیکن مجھے البتہ حیرت نہیں ہو رہی کہ اُن کی طرف سے جواب دینے کی زحمت نہیں فرمائی گئی۔ شائد وہ بُھول گئے ہوں گے لیکن میری اِس چیلنج کی عرضداشت کو گستاخی کی شکل میں محمول کرتے ہوئے مجھے البتہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول میں تین سال کی بلا جواز تاخیر کا سامنا کرانا نہ بُھولے۔

''اسلامیات'' کے اساتذہ کا قرآن پر انحصار کرنے والوں کی جانب جارحانہ رویہ:

لوگوں کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ مکتبِ مُلا کا تصور علامہ اقبال نے مسجد کے امام کے رویہ کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ اور عمومی طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ مکتبِ مُلا کے عام مولوی اور یونیورسٹی کے اسلامی سکالرز کی سوچ میں نمایاں فرق ہے۔ اِس عمومی رائے میں حُسنِ ظن سے فرق سمجھنے والے زیادہ تر وہ اصحاب ہوتے ہیں جن کو یونیورسٹی میں پڑھانے والے اسلامی سکالرز اساتذہ کی سوچ اور رویہ کا ذاتی تجربہ نہیں ہوتا۔ یونیورسٹی کے اسلامی سکالرز کے رویہ کے ضمن میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کرنے سے پہلے یہاں میں محترم پرویز صاحب کا ایک تبصرہ بھی یہاں بیان کرنا چاہوں گا۔

علامہ موصوف اپنے ہفتہ وار درسِ قرآن میں مزاحیہ جُملوں کی ادائیگی میں بھی احتیاط برتتے تھے کہ کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ اس لیے دورانِ درسِ قرآن یہ سُن کر تعجب ہوا جب وہ فرما رہے تھے کہ

اگر آپ نے کسی کو دین سے برگشتہ کرنا ہو، تو اُسے یونیورسٹی میں ایم اے (اسلامیات) کی کلاس میں داخلہ دلوا دیں۔

سمجھ میں یہی آ رہا تھا کہ شاید وہ مزاح کے علاوہ تلخ موڈ میں ہیں، لیکن بی۔اے اور ایم۔اے کی اسلامیات کی کلاسز کو مروجہ نصاب کی رہنمائی میں گائیڈنس دیتے وقت احساس ہوا کہ حسبِ معمول وہ یہاں حقیقت ہی کا اظہار کر رہے تھے۔

تحقیقی کام میں روکاوٹوں کا قومی زوال کا سبب ہونا:

ہمارے زوال کا اہم ترین اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس قوم کے پڑھے لکھے افراد تو رہے ایک طرف، اساتذہ بھی تحقیق کرنے اور جستجو رکھنے کے بجائے تقلید کا آسان رویہ اپنا کر اپنی فکر کو جمود بخش کر بانجھ کر دیتے ہیں۔ اِس طرح یہ اپنے تقلیدی نظریاتی دائروں میں گھومتے رہ جاتے ہیں۔ اور جو اِن تقلیدی دوائر سے آزاد ہو کر ہم خیال نہ رہنے کی جسارت کا مُرتکب ہونے کی مشق کرے تو انہیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ اِس لئے بھی کہ تقلیدی ہم خیال لوگوں کی موجودگی سے اُن کو بڑی سہولت رہتی ہے تاکہ لوگ فکر و تدبر سے حقیقت تک رسائی کر کے اُن کے استحصالی نظریات کے مقاصد سے آگاہی نہ حاصل کر لیں۔ یہ خطرناک اور تباہ کُن نتائج کے حامل کی بات ہماری سوئی ہوئی اُمت کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

تحقیق کی ضرورت/وجوہات:

عصرِ جدید کا فِکر وتدبر سے حاصل کیا ہوا علم اور قرآن کریم دونوں کی یہی تاکید ہوتی ہے کہ انسان کو سوچ بچار کے بعد اپنے مشاہدے۔ تجربے سے بھی کام لینا چاہیئے اور اِن سے اخذ کردہ نتائج کے مطابق بات کرنی چاہیئے۔ ہر شے پر بعد از تشکیک اپنی سی تحقیق کرنی چاہیئے۔ سنی سنائی پر یقین کرنا گمراہی اور جہالت ہے۔ اگر کوئی آپ سے سنجیدگی سے کوئی "مسلمہ مانی جانے والی" آئیڈیالوجی بیان کرتا ہے۔ تو اسے من وعن مان لینے کے بجائے اپنی سی کوشش اسے جاننے کی کیجئے۔ جستجو رکھیئے۔ تحقیق کیجئے۔ اسے مزید جاننے کی کوشش کیجئے۔ اگر وہ نظریہ درست نکلے تو ہی اسے مانئے ورنہ اپنے شکوک وشبہات کا اظہار کریں۔ کہ اپنی تحقیق میں کیا پایا اور اگر آپ کی تحقیق صحیح غلط کا فیصلہ نہ کر سکے تو مزید کوشش کیجیے اور کرتے رہیئے۔

یاد رکھیں "ایک شرارے سے شعلہ لپکتا ہے اور ایک شعلہ سے ایک بڑا الاؤ روشن ہوتا ہے۔" کسی بھی فلسفی، منطقی، مصلح کی بات کو بلا چوں چرا مان کر اسے اپنا عقیدہ بنا لینے کے بجائے تشکیک کیجیے۔ اور عقل کے گھوڑے دوڑایئے۔ غور وفکر کی عادت کو شعار بنالیں۔ اگر محقق۔ سائنسدان اور فلسفی حضرات وغیرہ استنادیت اور اذعانیت وادعائیت کو اپنا شعار بنا لیتے۔ تب کیا یہ دنیا اس مقام تک پہنچ پاتی جہاں آج کھڑی ہے؟ یقیناً نہیں! اگر معاشرے وسماج میں رائج مفروضات وتصورات ونظریات سے یہ لوگ نہ نکلتے تب ہم آج بھی پتھروں کے دور میں کھڑے ہوتے۔ ذرا سوچئے۔۔ تہذیب کے، نظریات کے، عقائد کے دائروں اور مصنوعی حد بندیوں سے انہیں باہر آ کر دیکھیں اور جانئے کہ صحیح کیا ہے غلط کیا۔ استنادیت سے چھٹکارا پایئے۔ ادعائیت کو خیر آباد کہیئے۔ فکر کے چراغ روشن کیجئے۔ اپنی فکر کی راہ کا تعین خود اپنے تجربہ وتحقیق کی روشنی میں کیجئے۔ اس دنیا نے فکری طور پر ابھی بہت آگے جانا ہے۔ کسی مخصوص جگہ قیام نہیں کرنا جو کہ تہذیب وتمدن کی موت کے مترادف ہے۔

علامہ اقبال نے اِس موضوع پر اپنے خُطبات میں فرمایا کہ:

"بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پسند طبقہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں کہ قانون سازی کے مسئلہ کے متعلق تنقیدی نقطۂ

نگاہ سے گفتگو کی جائے۔ اگر کسی نے اس بات کو اُٹھایا تو یہ اقدام بہت سے لوگوں کے لئے وجہ ناراضگی ہو جائے گا اور مخالفت کا دروازہ کھول دے گا۔''

ہمیں تحقیق کے میدان میں سب سے پہلے اپنی سمت کا تعین فہمِ قرآن پر ایک مکمل غیر جانبدارانہ تنقیدی تجزیہ لے کر کسی نتیجہ پر پہنچنے کی راہ متعین کی جائے۔

قرآن کریم میں ہے کہ:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ (12:108)

کہو: یہی میری (رسول ﷺ کی) راہ (سنت) ہے کہ میں تمہیں علی وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں، اور جو میرے متبعین ہیں، وہ بھی آغاز میں مذہب کے پرچار کرنے والوں سے ہم پوچھتے ہیں کہ کیا دنیا میں قرآن کے علاوہ کوئی اور کتاب بھی ایسی ہے جسے آپ بلا سمجھے پڑھتے ہیں کسی ایسی زبان میں لکھی ہوئی کتاب تو ایک طرف رہی جسے آپ جانتے ہی نہ ہوں، اگر کتاب کی زبان آپ جانتے ہوں اور وہ کتاب آپ کی استعداد سے زیادہ مشکل ہو تو بھی آپ اسے نہیں پڑھیں گے کہ جب کچھ پہلے ہی نہیں پڑتا تو پھر اسے پڑھا کس لیے جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دوقومی نظریہ پاکستان کے حوالہ سے قائداعظم نے رسولِ اکرم ﷺ کے زبان سے ہر فرد کو جو ہدایت دی ہے کہ وہ خود قرآن سے راہنمائی حاصل کرے، تو یہ ایک مثالی صورتِ حال کہلاتی ہے۔ یہی قرآنی موقف پر مکمل انحصار کرنے کی روش کا سبھی بانیانِ پاکستان کا بھی موقف رہا ہے۔

مقالہ کا خاکہ اور حاصلِ مبحث:

پہلے ایڈیشن میں کتاب کے مقدمہ سے تعارف کے بعد اِس کو درجِ ذیل تیرہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، اور اِن ابواب کی مدد سے، کتاب کے موضوع ''دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبہِ پاکستان'' کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

1۔ دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبہِ پاکستان کی آگاہی میں قرآن کا کردار۔

2۔ دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبہِ پاکستان

3۔ اسلامی نظامِ حکومت (دین الاسلام) کا تصور و مقصد

4۔ اِسلامی حکومت کے مقاصد کا حصول نظریہ ارتقاء میں

5۔ نظریہ ارتقاء میں علمِ انسانی کا مقام

6۔ حیوان سے انسان کے ارتقاء کے نظریہ کا علمِ نفسیات کی رو سے جائزہ

7۔ مسلۂ جبر و قدر کا نظریہ ارتقاء میں مقام

8۔ نظریہ ارتقاء میں انسانی ذات کے تصور کا مقام

9۔ نظریہ ارتقاء ذات کی نشوونما میں

10۔صفاتِ خداوندی بطور انسانی ذات کی نشوونما کا معیارِ مُطلق

11۔اسلامی حکومت کا عملی قیام

12۔اسلامی حکومت کے مُطلق اور غیر مُتبدل قوانین (اصول واقدار)

13۔اسلامی حکومت کی تشکیل کے دوران معاشرہ میں ذات کی نشوونما کے اصول

نتائج:

ہر باب میں متعلقہ عنوان کے تحت یہی کوشش رہی ہے کہ موضوع کی عصرِ حاضر کی تحقیق کے مستند حوالوں سے قرآن کے متن کی روشنی میں وضاحت کرسکوں۔

آخر میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ مقالہ میں نظریہ پاکستان کی صراحت میں، جن قرآنی آیات کا انتخاب کیا گیا ہے، اور اُن سے جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں، اُن سب کی ذمہ داری میری اپنی ہے۔ اِن میں اگر کسی قسم کی غلطی یا کمی رہ گئی ہو، تو اُس کے لئے پوری ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ قارئین کرام سے البتہ میں ضرور یہ اُمید رکھنا چاہوں گا کہ وہ ایسی کسی بھی کوتاہی سے مطلع کر کے مجھے اصلاح کرنے کا موقع فراہم کریں گے۔ میری حتی الوسع یہ کوشش رہی ہے کہ کتاب کے عنوان کے تحت نظریہ پاکستان کی وضاحت، قرآن ہی کی سند کے حوالے سے سامنے لاسکوں۔

تحقیق کے اصولوں کی پاسداری:

میں نے ایم اے سے لے کر ڈاکٹریٹ تک ''اسلام اور فلسفہ'' کو خصوصی مضمون کے طور پر اپنی تحقیق کے لئے منتخب کیا۔ اس لئے میں اس امر سے آگاہ تھا کہ تحقیق میں لازم ہے کہ، (حوالہ جات کے لئے شخصیتوں کی اہمیت اپنی جگہ)، ذمہ داری اور جواب دہی مقالہ نگار کی ہی ہوتی ہے۔ اسی تحقیقی اسلوب کو مدنظر رکھتے ہوئے، قرآنی تصورات کو اجاگر کرنے میں دیئے گئے حوالہ جات پر انحصار نہیں کیا گیا بلکہ جہاں ضرورت محسوس کی، خود اصل سند سے، اس کی تصدیق کی، اور مطمئن ہونے کے بعد استفادہ کیا۔ ان مفاہیم کے بیان میں میری حتی المقدور کوشش یہ رہی ہے کہ اپنے مباحث کو دو قومی قرآنی نظریہ پاکستان کے ساتھ وابستہ رکھتے ہوئے قرآن ہی کی حد تک محدود رکھوں، اور فلسفیانہ علمی، تحقیقی، تنقیدی اور منطقی اصولوں کی راہنمائی میں دلائل کی پاسداری کروں۔ میری قارئین کرام سے یہی گزارش ہے کہ آپ بھی حق کی تلاش میں میری گزارشات کا مطالعہ، انہی درج بالا اصولوں کی روشنی میں کریں۔

اظہارِ تشکر:

یہاں مجھے درج ذیل محسنین کا شکریہ ادا کرنا ہے:

1۔لغات القرآن کے مؤلف مُفکرِ قرآن غلام احمد پرویز، جنہوں نے عربی زبان میں بیان کردہ مستند ترین لغات کے الفاظ کو اردو زبان میں منتقل کر کے اُردو دان تحقیق کے طالب علموں کے لیے، گراں قدر سہولت بہم پہنچائی۔ میں نے مقالہ کی تیاری میں، اس سے بہت استفادہ کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ احتیاط بھی برتی ہے کہ باقاعدہ عربی زبان پر عبور کے حصول کے بعد جہاں ضرورت پیش آئی، وہاں اِس لغت میں مستند ترین حوالوں اور اُن کے مآخذ کی باقاعدہ تصدیق کرتے ہوئے اپنی تسلی بھی کرلی۔

2۔نظریہ پاکستان کونسل (ٹرسٹ)، اسلام آباد کے چیئرمین، جناب زاہد ملک صاحب کا جنہوں نے مجھے دوقومی قرآنی نظریہ پاکستان پر کتاب لکھنے کی ذمہ داری کے قابل سمجھا اور اس کا پہلا ایڈیشن شائع کرایا۔

3۔سب سے اہم (چھوٹا منہ اور بڑی بات) قرآن کریم کا شکر گزار ہوں، جس کی وجہ سے حقیقت کی جستجو کی طلب میں علمی، تحقیقی، تنقیدی اور منطقی انداز لیے علم وبصیرت کی رفاقت میں ریٹائرمنٹ کے بعد زندگی گزارنے کی امنگ کو نئی قوت حاصل ہوئی۔

اعتراف:

آخر میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ مقالہ میں نظریہ پاکستان کی صراحت میں، جن قرآنی آیات کا انتخاب کیا گیا ہے، اور اُن سے جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں، اُن سب کی ذمہ داری میری اپنی ہے۔ اِن میں اگر کسی قسم کی غلطی یا کمی رہ گئی ہو، تو اُس کے لئے پوری ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ قارئین کرام سے البتہ میں ضرور یہ اُمید رکھنا چاہوں گا کہ وہ ایسی کسی بھی کوتاہی سے مطلع کر کے مجھے اصلاح کرنے کا موقع فراہم کریں گے۔ میری حتی الوسع یہ کوشش رہی ہے کہ کتاب کے عنوان کے تحت نظریہ پاکستان کی وضاحت، قرآن ہی کی سند کے حوالے سے سامنے لاسکوں۔ میری یہ کاوش کسی ایک فرد کی توجہ حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوسکی تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری محنت کا اجر مل گیا۔

دروس القرآن کی نئی جلدیں شائع ہوگئیں

مطالب القرآن فی دروس الفرقان کے سلسلہ کی مزید تین جلدیں شائع ہوگئی ہیں۔ جس کی تفصیل درجِ ذیل ہے:

1۔سورہ آلِ عمران (جلد اوّل)، صفحات: تقریباً 500، قیمت: 500

2۔سورہ آلِ عمران (جلد دوم)، صفحات: تقریباً 500، قیمت: 500

3۔سورہ ھود، صفحات: 400، قیمت: 400

4۔سورہ یوسف، صفحات: 300، قیمت: 300

5۔سورہ الرعد، سورہ ابراہیم، سورہ الحجر، صفحات: 500، قیمت: 500

ملنے کا پتہ:

ادارہ طلوع اسلام 25 بی گلبرگ 2 لاہور

Phone: 042-35714546, Cell: 0321-4460787

Balancing Our Inner and Outer Worlds

By Mansoor Alam

It is now known that the old theory of a static Universe is no longer tenable. Modern science has revealed that there is nothing fixed or static in the Universe, and it has been expanding ever since it came into existence.

Thus, by nature of its creation, our Universe is dynamic and everything in it is perpetually changing.

Our Earth has been changing as well. Scientists say that it has taken millions of years and several eons of adaptation for it to become suitable to support life.

Our mountains, oceans, deserts, and forests have traded places on Earth through the shifting sands of time; so has the life that it supports. Some species have come and gone and others have adapted to change. These natural changes have occurred everywhere on Earth: in its air, on its land, and under its seas. Here also, there is nothing fixed or static.

Our Earth has existed far longer than human beings. So have all other living species. Therefore, they are well adapted to natural change. The same may not be said of us humans, though. Endowed with the power of rational thinking, humans also have the ability and willingness to destroy themselves. According to Einstein:

> *"By painful experience we have learnt that rational thinking does not suffice to solve the problems of our social life. Penetrating research and keen scientific work have often had tragic implications for mankind, producing, on the one hand, inventions which liberated man from exhausting physical labor, making his life easier and richer; but on the other hand, introducing a grave restlessness into his life, making him a slave to his technological environment, and—most catastrophic of all—creating the means for his own mass destruction."*
>
> [Albert Einstein, Out of My Later Years, p. 152]

The main motivation of powerful nations pursuing this course is to dominate weaker ones – by hook or by crook. Initially, the self-destructive forces produced by following such a course remain relatively imperceptible, thus producing a false sense that their power will last forever. But as time goes on, these nations meet their eventual destruction despite their power. History is full of such stories: ancient Babylon, Egypt, Greece, Iran, Rome and even

some parts of the New World are now graveyards of powerful civilizations. This destruction is not a random act but is the result of their wrong actions based on the law of the rise and fall of nations.

Actually, there are two aspects of this law i.e., two sides of the same coin. Both are essential, for the rise, growth, and the moral and intellectual advancement of a nation: i) knowledge of the forces of the outer world, and ii) knowledge of the forces of the inner world within human beings. One without the other is bound to lead to ultimate destruction of any civilization. With proper balance between these two forces, human societal advancement will know no bounds, both intellectually and spiritually.

But first of all, let us be clear that a nation cannot hope to recover from its abyss unless it changes its inner self. Stopgap measures or doing patch up work only to treat the symptoms would only prolong suffering and would not cure the disease. A nation needs a fundamental change in its outlook, its psychology, and its attitude if it truly wants to change its destiny.

One way to achieve glory is by assigning two separate arenas of human thought: one for *scientific* thinking – done by people of *science*, and the other for *religious* thinking – done by people of *religion*. One is not allowed to interfere with the other. Religious people take charge of Religion and its hierarchy, and the science people take charge of Science and its hierarchy.

After Galileo was sentenced to death by the Church for his *scientific* thinking that was in conflict with the Church, it made perfect sense to the West to create these two mutually exclusive compartments of human thought. This separation has apparently enabled the West to gain mastery over the forces of the outer world as never before.

Since at the present time we are in the grips of this Western approach, we tend to believe that this *is* the way to glory. But let us see what modern Western thinkers have to say about this approach.

> *"For science can only ascertain what is, but not what should be, and outside of its domain value judgments of all kinds remain necessary.... Representatives of science have often made an attempt to arrive at fundamental judgments with respect of values and ends on the basis of scientific methods and in this way have set themselves in opposition to religion. These conflicts have all sprung from fatal errors. . . For the scientist, there is only "being," but not wishing, no valuing, no good, no evil, no goal."*
>
> [Albert Einstein, Out of My Later Years, p. 152]

> *"We began our era of scientific efficiency confident that*

materialistic triumphs would solve life's problems. We are finding we were wrong. Life is not as simple as that."

[J.W.T. Mason, Creative Freedom, pp 183-4.]

"Man has created a new world with its own laws and destiny. Looking at his creation, he can say, truly, it is good. But looking at himself what can he say? ... While we have created wonderful things we have failed to make of ourselves beings for whom this tremendous effort would seem worthwhile."

[Erich Fromm, Psychoanalysis & Religion, pages 1-2]

Why does the West fail to deal with the complex problems of humankind? After all, the West came to their current methodology after a long, hard fought battle with the Church resulting in the constitutional separation of the Church and the State. The answer may actually lie in the very principle of the separation of Church and State which essentially created a dualistic self: one private, the other public; one related to the Church, the other related to the State; one subjective, the other objective; one devoted to Sunday, the other devoted to the rest of the days.

Thus, God became associated with the private life of citizens while the State took control of their public life. Forces within the inner world of human beings thus became disassociated with the forces of their outer world. This created tension in people's inner and outer worlds. All the power the West has mustered through the control and mastery over the outer world seems unable to control the destructive forces of its inner world. One has become bright and shiny while the other has remained dark and gloomy. The fullness of body and emptiness of the soul are the obvious manifestations of practicing this Western approach to life. In the words of Erich Fromm:

"Ours is a life not of brotherliness, happiness, contentment but of spiritual chaos and bewilderment dangerously close to state of madness --- not the hysterical kind of madness which existed in the Middle Ages but a madness akin to schizophrenia in which the contact with reality is lost and thought is split from affect."

"Those who try to find a solution by returning to traditional religion are influenced by a view which is often proposed by religionists, that we have to choose between religion and a way of life which is concerned only with the satisfaction of our instinctual needs and material comfort...Priests and ministers appear to be the only professional groups concerned with the soul, the only spokesmen for the ideals of love, truth, and justice."

[Psychoanalysis & Religion, pages 1-2.]

Contrary to the approach practiced by the West, the past glory of Muslims in Science was not the result of separation of science and religion. Those revolutionary Muslim scientists were truly devoted to religion while carrying out their scientific studies. There were no contradictions between their scientific thinking and their religious thinking. In fact, the driving force behind their scientific discoveries was the Quranic command to observe the signs of God spread throughout the Universe (3:189-191, 16:48, 21-30-32, 23:18, 26:7-8, etc.).

The achievements of those Muslim scientists were truly astounding—maybe more than the Western scientific achievements—because they were pioneers in creating and advancing so many branches of new knowledge (without the modern facilities enjoyed by later scientists). It may even be fair to say that there would not have been a Western renaissance in such a short time without Muslim achievements in science. Western historians of science (e.g., Robert Briffault, George Sarton, John W. Draper) generally recognize the fact that the West actually built its scientific superstructure on the giant shoulders of great Muslim scientists of the past.

So, there we have it: two distinct approaches to science. One may be called the isolationistic approach, the other holistic or integrated approach. These two approaches create their own distinctive social, cultural, and moral environments. This is where the second aspect of the rise and fall of nations comes into play. The inner soul of the Western society is suffering from its isolationist approach even though it has acquired unprecedented power over the forces of nature through science. Poet Iqbal (1877-1938) has beautifully captured this dilemma of the West thus:

He, who seeks the path of stars in the outer world;
Could not travel the path of his own thoughts!
He, who has captured the rays of the shining Sun;
Couldn't find the morn of his life's own dark night!

In other words, human reason can subdue the forces of nature but cannot by itself find a satisfactory solution to the complexity of the problems of humankind. The holistic or integrative approach is the *only* way to balancing both aspects of human existence: material (the outer world) as well as spiritual (the inner world) which is: 1) to acquire knowledge of the forces of the Universe and 2) to use its power for the benefit of *all* humankind without any discrimination whatsoever. This is how we can create long-term balance between the outer and inner worlds.

Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل)**

Chapter 3: Spring's Message (*Payam-e Fasl-e Bahar* پیام فصل بہار) –

Message to Fellow-Ambassadors

(Tulu-e-Islam Convention, November, 1959)

By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam)

Episode No. 3

Only that progress and evolution will sustain in the long run in which all members of human family are equally respected and involved. Otherwise, a society no matter how advanced and evolved stagnates and suffers intellectual and cultural death and will descend into hell like other nations. The Quran has used the word جحیم (*Jaheem*) for hell which means stagnation. Whenever a nation starts stagnating that is when its hell begins.

Taste of laziness from action is self-imprisonment;
The hunter waylays its victim if its hands fold up!

This is the secret of progress and evolution that the Quran mentioned 1400 years ago, and which only now modern sociologists and anthropologists have started discovering it. But we do not have to go outside to seek the proof of it; the proof resides in our own house. That is, the history of the rise and fall of Muslims is a reflection of this reality.

Causes of our rise and fall

When a small group of individuals from the land of Hijaz understood the power of this Quranic wisdom then they created such a unified party – by removing all the distinctions of: ruler and ruled; high and low status; rich and poor; and Arab and non-Arab – with the underlying core principle that in every individual's effort and earning ability, all are equal participants. After the opening Surah the Quran has described the attributes of such individuals when it declares: وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (2:3) – whatever We have provided for them they keep it open for the betterment of others. What is the limit of this opening? The Quran replies: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (2:219) – They also ask you as to how much they should spare for the help of others. Say: all that is surplus to your needs. *This* they were commanded to do. But they went beyond this: وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (59:9) – They always give preference to the needs of the others, even if they themselves are indigent and living a life of hardship.

Today, it has become a puzzle as to what is the economic system of Islam. And if someone is told that no surplus wealth remains with anyone in this system then he sees the germs of communism in this system. However, when the philosophy of evolution of human abilities as given in the Quran is understood, then there remains no mystery in understanding its economic system. As mentioned above, its philosophy is that a system in which an

individual, or a group, or a nation keeps to itself the output of its efforts, then the progress of that individual, that group, that nations stops; and it cannot move forward after reaching a certain point. The Quran calls this type of mentality as بخل (*Bukhl* or miserliness) and says: وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ (47:38) – They should know that the one who is miserly in this matter, in fact, harms none but himself. He stops his own self's development. In contrast to this, a group or a nation develops itself further when it tries to help develop others: وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ (35:18) – Whoever provides nourishment to others, he himself receives the same in return. This was the crux of the principle that that small group of the people of Hijaz had understood. The result was that their progress became limitless. There was neither any mystery, nor any puzzle, nor any ideology beyond understanding, nor any supernatural formula in this limitless achievement.

What happened later?

Well, the later followers abandoned that principled law of evolution. They restricted the wealth individually and within limits of their family. One group within the nation became the ruler and thus power and authority became limited within a particular group. And beyond this the entire nation imprisoned itself within its boundary walls of nationhood by ignoring the concept of universal brotherhood of humankind. This was the condition of worldly people. And the so-called people of God imprisoned themselves for "spiritual" progress within the walls of monasteries cutting themselves off from the rest of humanity. And on top this, the people of Sharia started telling that Islam's purpose is achieved if everyone became pious in their own boundary walls of individual religions. The result was that the nation of Islam as a whole stopped at the place where it was; and became fossilized in time capsule. This is the hell or جحیم (*Jaheem*) that the Muslim nation is in since that time. The meaning of stopping at one place is that intellectual abilities of such a nation become devoid of evolution. That is, that nation does not possess the abilities of thinking and rational understanding. How clearly the Quran describes this situation when it says: وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ (67:10) – Truly we did not utilize our intellect and ability to think; and we opposed him (the warner) with sheer prejudice and stubbornness. Had we listened to him attentively and used our intellect, we would not be in this Hell?

There is another point to note here. A nation that abandons its thinking at a certain point of its evolution deceives itself that *that* is its pinnacle of humanity; and that no other nation can reach that level. That is how it pretends itself that its hell is heaven; and does not want to get itself out of the hell it is really in. In other words, it does not see its hell. This is because one can only

see the prevailing hell only if one has the ability to see it: وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى (79:36) – Hell will become visible to those who are capable of seeing it.

***

Summary of our discussion until this point

This was, my dear friends, the related point that had come in the course of our discussion about why the Quran puts so much emphasis on universality of the humankind. Since we drifted somewhat from our topic, it seems necessary at this point to recap the story in few words in order to maintain continuity with what we were discussing until this point.

1. The difference between secular state and divine state is that to secular state the only thing counts is the protection of national interests; and political opportunism and expediency become the tools and policies to achieve them. On the other hand, the purpose for which the divine state strives is to protect the eternal principles or universal permanent values; and lays down policies and procedures to implement them in real life. The secret of humankind's welfare and benefit, and its progress and evolution lies in practical realization of these eternal principles.
2. These eternal principles are clearly spelled out in the Quran. The constitution of the Islamic state is built on these principles.

Fear and grief

The Quran has summarized in just few words the result of the divine state: فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) – those who will order their lives in accordance Our guidance, will suffer no fear and sorrow. Those who tread the life under the guidance of Allah's book will remain free of fear and free of grief.

To remain free of fear is political security and to remain free of grief is economic independence. There would be no political oppression of any kind in this state. There would be no economic dependence of any sort in this state. In the words of Iqbal:

There will be no dependence in this state of any kind;
This is the meaning of the clear Sharia, in a nutshell!

***

Form of government

As far as the form of government is concerned, the Quran has not given any specific details about it. But it does specify an eternal principle behind it: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38) – They decide their affairs through mutual consultations and according to Divine Laws. Matters of state will be decided by mutual consultation of the Ummah in the light of the Quran.

The machinery of government will not reside under the control of any individual, or family, or group. This will remain under the collective trusteeship of the Ummah which will hand it to its representatives. And as has been mentioned earlier the standard for selecting Ummah's representatives will be: اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ ؕ (49:13) – According to the Divine Law the criteria to determine status or superiority is how closely and consciously one follows and guards the Divine Laws? And Who obeys Allah more? The one whose whole life will be in conformity with this criterion will be the most worthy of respect. The criterion for superiority in this state will not be race or status, but personal character and behavior.

Those who are the closest in obeying the laws of Allah will be the most respected. And these people will represent the Ummah who, by adhering to the boundary lines of eternal universal principles of the Quran, will form the detailed laws and will decide the form of government depending on the demands of the time and the circumstances.

My dear friends, you would have realized by now that Islamic government is not the name of any specific form or style of government. It is a means to protect and propagate the permanent values as determined by the Quran; and the government machinery is to practically establish and implement them. Whatever means are acquired to achieve this goal will be called Islamic provided that these means do not violate the principles of the Quran. By keeping the Quranic values intact, whatever style or form of government is adopted that will be Islamic.

Difficulties in constitution making

In the light of these explanations, my dear friends, could there be any difficulty in drafting and compiling an Islamic constitution? In this process all the difficulties that we encounter are our own – conscious or unconscious – self-creations. Our most fundamental mistake is that we take Islam (without thinking) as one comprising of rituals and Sharia laws of the period when the train of دین (*Deen*) was hijacked by kings and put on a different track. Unless and until we come out of this misunderstanding and keep accepting that version of "Islam" as the true Islam, even the concept of Islamic constitution won't appear before us. Those who are involved in this misunderstanding must understand that the religion of "Islam" that they are promoting; and the Sharia law that they are pushing for adoption as the state's constitution; and think that this way we will regain our standing as a developed nation among the community of nations – then they are gravely mistaken. What they are advocating is the non-Quranic religion in the name of Islam. The Quran's دین

دین (*Deen*) guarantees its followers the leadership of the world among its contemporary nations, let alone being in the ranks of developed nations.

The religion of the enliven hearts is not a pipedream;
They create another world from the dust of old realm!

And when it is the fact that our current religion is not the real Islam then asking its custodians to give us the Islamic constitution is nothing but self-deception.

Who knows who has told these naivetés?
One who picks up sword becomes Farhad!

Our scholars and Islamic constitution

The prerequisite for Islamic constitution is that one must have full comprehension of the permanent values of the Quran and be knowledgeable about the contemporary issues of the time. As for our Ulemas, the so-called Islamic scholars, they are devoid of both. Therefore, to turn to them for framing the Islamic constitution is fundamentally wrong. In the words of Iqbal:

What is nation; and what is leadership of nations?
How the Mullahs of ritual-based Islam could fathom?

The Quran says: اِنَّ اللّٰهَ یَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَهۡلِهَا ۙ (4:58) – In order to establish the Quranic system, it is necessary to entrust responsibility to those who are capable of discharging it. Drafting a constitution requires huge responsibility. It is a great trust on behalf of the people. It cannot be entrusted to those who are not worthy of this trust. Otherwise, it will be a breach of trust. We made this mistake once and have been suffering for nine years. If we lose this opportunity again – which Allah has given us – to redeem ourselves, then our punishment will be much severe this time.

My dear friends, at this time I want to clarify one point. When I criticize the custodians of our present religion then it is not directed against any specific individual but to the institution of priesthood which has no place in Islam. As for individuals, there are many whom I respect very much because of their character and integrity.

***

If people become pious then State will become Islamic

In regards to Islamic constitution it is heard from certain quarters that if people become true Muslims; if they become pious; if they become honest – then the state will automatically become Islamic. This logic is very interesting. This is similar to saying to those who are in-charge of government: Please fix the machinery that runs the government so that the crimes and corruption disappears; so that respect for laws develops in people's hearts; so that they could live in peace and security. In reply to this the government will say: if people respect the laws; if they don't commit crimes and live life as peaceful citizens – then the government will automatically become good.

The Quran mentions a great point in regards to the above arguments. It says that as far as individual ethics is concerned it is found just about everywhere. No one advocates:

lying, stealing, deceiving, oppressing, exploiting people, etc. In contrast, it is encouraged everywhere that: be honest, don't steal, don't deceive, don't oppress, live a life of piety, etc. But, despite this, it is a fact that people do not practice what they preach. Religion only preaches; it only considers its duty to give sermons to people about piety and honesty. The Quran says that sermonizing is not enough. People won't become pious and honest by sermons only. It is not because the sermons do not have impact on people; it is not that people do not want to become honest and pious. Except few who are deliberately criminal minded, pathologically dishonest, and willfully transgressing; most people want to live life along the right path, but, despite this, they are not able to. It is not their fault in this. It is extremely difficult, if not impossible, to lead life on the right path in wrong and corrupt society. It may be the case that an individual may develop good personal qualities in his character; but in collective societal matters individual reform would never become effective. For this it is necessary to establish a society in which it is not only easy to lead life on the right, but that it should also be comfortable and satisfying. That is, just as it is extremely difficult, and one faces roadblocks after roadblocks at every step, to lead a right life in a wrong society; in the same way, in the right society, it becomes extremely difficult for a person to lead wrong life in a right society.

Just as water flows easily downstream, it becomes easier to lead life on the right path in a right society.

The Quran, the truth teller

The Quran tells the people of the book: مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (4:47) – O Prophet (PBUH)! Tell these people of the book: that not only I have brought a Book, the Quran, which is the complete code of life, but also that it validates the claims made in your scriptures. For example, you say that oppressors will never be able to flourish. The Quran also says this: اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ۝ (6:135) – Allah never lets the oppressors succeed. But despite your sermons, oppressors continue to succeed. So, I have brought the practical program which actually proves that oppressors will not succeed. The name of this practical program is Islamic state. It is impossible for an individual to put the world on the right path. The forces of evil are so strong and so wide-spread that it is impossible to face them individually. The Quran teaches us to face the facts. That is why it does not tell something to individuals which is beyond their power.

The goal of mysticism

The Quran declares that mysticism is not from Allah, but it is an ideology created by human mind. This ideology does not mean that one need to go to jungle and lead a life of asceticism. The meaning of this ideology is to live individual life; to try to be pious on an individual basis. The Quran declares this type of life against Allah's will of leading a collective life. This is what it calls Islamic state.

How Islamic state makes people pious?

At this point let us make it clear that the Islamic state does force people to become pious. Force is used only against deliberate transgressors of laws. It has a different program for making normal people pious.

To Be Continued...

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور سُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔



(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)



PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 70
ISSUE
3

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/



قومیں ایک دن میں نہیں بنا کرتیں

''آپ اچانک ایک نئی دنیا تخلیق نہیں کر سکتے۔ حصولِ آزادی کے لئے آپ کو ایک عمل سے گزرنا ہوگا۔ آپ کو آگ کے دریا، ابتلاء اور قربانیوں کی راہ سے گزرنا پڑے گا۔ مایوس نہ ہوں۔ قومیں ایک دن میں نہیں بنا کرتیں لیکن جیسا کہ ہم رواں دواں ہیں ہمیں ایسے قدم اٹھانے چاہئیں جو ہمیں آگے کی طرف لے جائیں۔ آپ حقائق کا مطالعہ کریں۔ ان کا تجزیہ کریں اور پھر اپنے فیصلوں کی تعمیر کریں۔''

(کلکتہ یونیورسٹی، پوسٹ گریجوایٹ طلباء سے قائداعظم کا خطاب، کلکتہ 21 اگست 1936ء)